جلد ۸۷ جولائی ۱۹۷۷ء عدد ۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ضروری اعلان

ہم انتہائی افسوس اور معذرت کے ساتھ اعلان کرنے پر مجبور ہیں کہ ناقابل برداشت مہنگائی کی وجہ سے رسالہ کی قیمت میں اضافہ ہمارے لئے از بس ضروری ہوگیا ہے۔ لھذا اب ماہ اگست ۱۹۷۷ء سے عام پرچہ کی قیمت ۱٫۲۵ کی بجائے ۲/- روپے ہوگی اور سالانہ چندہ ۱۲/- روپے کی بجائے ۲۰/- روپے ہوگا:

امید واثق ہے کہ آپ ہم سے تعاون فرمائیں گے۔

منجانب

ناظم ادارہ ترجمان القرآن

۵ اے ذیلدار پارک۔ اچھرہ۔ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۸۷ | جولائی ۱۹۷۷ء مطابق رجب ۱۳۹۷ھ | عدد ۵

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک - اچھرہ - لاہور

فون نمبر ——— ۴۱۱۰۱۶ ——— ۴۱۱۰۱۷

زرسالانہ بارہ روپے - فی پرچہ ۲۵/۱ روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: محمد شفیع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اشارات

سائنس اور ادب میں علامت (SYMBOL) اور رمزیت (SYMBOLISM) کو جو بھی اہمیت حاصل ہے، اُس کے اعتراف کے باوجود یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مذہب دشمن عناصر نے مذہب کی تضحیک و تذلیل کے لیے ان سے بڑا فائدہ اُٹھایا ہے۔ جس طرح نظم و نثر میں استعارات اور تشبیہات کے بغیر چاشنی پیدا نہیں ہوسکتی، اِسی طرح موزوں علامات کے بغیر ان میں اختصار اور معنویت کا حُسن بھی پیدا نہیں ہوتا۔ اِس بنا پر علامات کا استعمال ہمیشہ فصاحت و بلاغت کی ایک ناگزیر ضرورت رہا ہے۔ ہمارے ہاں اردو ادب میں لاتعداد ایسی علامات رواج پاچکی ہیں جن کی تہ میں معانی و مطالب کے گنج ہائے گرانمایہ موجود ہیں۔ مثال کے طور پر خالد ہمارے لیے محض ایک نام ہی نہیں بلکہ یہ ایک علامت ہے جرأت، پاکبازی، انتہائی جذبۂ ایثار اور شوقِ شہادت کی۔ اِسی طرح ہلاکو خان محض ایک فاتح نہیں، بلکہ یہ ایک علامت ہے درندگی اور شقاوتِ قلب کی۔

پھر تاریخ اور ادب اِس حقیقت پر بھی شاہد ہیں کہ جہاں لوگوں نے مختلف علامات کو مختلف مطالب بیان کرنے کے لیے پوری دیانت داری کے ساتھ استعمال کیا، وہاں بعض بدطینت افراد نے اُن سے کچھ طبقوں کو رسوا اور ذلیل کرنے کا بھی کام لیا۔ یہ ناپاک کوشش یوں تو ہر دَور میں کسی نہ کسی صورت میں ہوتی رہی ہے لیکن مارٹن لوتھر کی سرپرستی میں رومن کیتھولک کے خلاف جو تحریک اُٹھی، اُس میں علامت کے ہتھیار کو بے دریغ استعمال کیا گیا۔ مذہب کے جن معتقدات، افعال و اعمال، اخلاقی معیارات اور طبقات کے خلاف ذہن کے اندر تکدر پیدا ہوا اور جنہیں اپنے دلپسند نظریات سے ذرا دُور پایا،

اُن کے لیے پہلے تو نفرت انگیز علامتیں وضع کی گئیں اور پھر ان علامتوں کے ذریعہ اُنہیں معاشرے میں بدنام کرنا شروع کر دیا گیا۔

آپ خود سوچیے کہ 'پادری' کا لفظ سن کر آپ کے ذہن میں آخر ایک ایسے شخص کا تصور اُبھر کر کیوں آتا ہے جس پر جنون کی کیفیت طاری ہو، جس نے عقل و فکر کی ساری قوتوں کو خود تیاگ دیا ہو، جس کی آنکھوں پر تعصبات کی پٹیاں بندھی ہوئی ہوں، جو ترقی کا سب سے زیادہ مخالف ہو، جسے انسانی ضمیر کو کچلنے میں بڑا مزہ آتا ہو اور جس کی سرگرمیوں کا محور صرف یہی ہو کہ مذہب کے نام پر سادہ لوح عوام کو دھوکہ دیا جائے۔ مذہبی رہنما کی یہ بھیانک تصویر کس نے تیار کی اور کیا جس شخص نے یہ مذموم حرکت کی ہے اُس کے بارے میں سینے پر ہاتھ رکھ کر کوئی منصف مزاج شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اُس نے ایسا کرتے ہوئے عدل و انصاف سے کام لیا ہے؟

یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ لوگ آخر ایسا کیوں کرتے ہیں؟ اس کی دو وجوہ ہیں: ایک وجہ تو صاف اور ظاہر ہے کہ عوام اپنے مذہبی رہنماؤں کو سیرت و کردار کے اعتبار سے اُس بلند مقام پر فائز دیکھنا چاہتے ہیں جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کرام کو فائز کیا اور اپنی اس نیک اور مقدس خواہش میں اس عظیم فرق کو بھول جاتے ہیں جو ایک نبی اور غیر نبی کے درمیان پایا جاتا ہے۔ نبی منزہ عن الخطا ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ خود اُسے ہر لغزش اور ہر گناہ سے محفوظ رکھتا ہے، لیکن باری تعالیٰ نے یہ اہتمام غیر نبی کے معاملے میں نہیں کیا۔ اِس بنا پر کسی نیک سے نیک شخص سے بھی بڑے سے بڑا گناہ سرزد ہو سکتا ہے۔ اِس بنا پر کسی غیر نبی کے اخلاق کو نبی کے اخلاقی معیار پر پرکھ کر اُس پر کوئی حکم لگانا درست نہیں۔ مگر عوام اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں اور خود تو جو چاہیں کرتے رہیں لیکن ایک دیندار شخص سے یہ ضرور توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہر کوتاہی سے پاک ہو اور جب اُنہیں اپنی توقعات سو فیصد پوری ہوتی نظر نہیں آتیں تو مذہبی طبقے کے بعض افراد کی چند کوتاہیوں کو دیکھ کر وہ یہ فیصلہ صادر کر دیتے ہیں کہ پورا مذہبی طبقہ ہی بگڑا ہوا ہے اور اپنی اس رائے کو اِس شد و مد کے ساتھ پھیلاتے ہیں کہ مذہبی طبقہ بُرائی کا نشان بن کر رہ جاتا ہے۔ وہ ایسا کرتے وقت اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ ایک طبقے کی چند انفرادی لغزشوں کو سامنے رکھ کر

کوئی عمومی نتیجہ اخذ کر لینا ایک منطقی مغالطہ ہے۔ تخصیص سے تعمیم کا اصول اُن معاملات میں تو کسی حد تک درست ہو سکتا ہے جہاں اُن میں یکسانیت موجود ہو، لیکن جہاں ہر معاملے کی نوعیت الگ اور جداگانہ ہو وہاں کسی خاص معاملہ پر قیاس کر کے کوئی عمومی نتیجہ نکالنا کسی طرح بھی درست نہیں ہوتا۔ مذہبی گروہ کے ان بے سمجھ غیر اندیشوں کی اگرچہ نیت بخیر ہوتی ہے لیکن ان کی غیر ذمہ دارانہ باتوں سے مذہب دشمن خوب فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

مذہبی طبقوں کو بدنام کرنے کی دوسری وجہ فسادِ نیت اور خبثِ باطن ہے۔ مذہب کے بارے میں عوام کے احساسات چونکہ بڑے نازک ہوتے ہیں اس لیے اگر انہیں معمولی ٹھیس بھی پہنچائی جائے تو وہ برہم ہو جاتے ہیں، اس بنا پر مذہب سے کد رکھنے والے آبرو باختہ اور دوں ہمت طبقے کو اس بات کی جرأت تو نہیں ہوتی کہ وہ مذہب کے خلاف براہِ راست کوئی بات کر کے عوام کے غیظ و غضب کا نشانہ بنے، بلکہ وہ رمزیت کی مدد سے مذہب کے خلاف اپنی دلی نفرت اور بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔ یہاں ہمارے پیشِ نظر یہ بات نہیں کہ دوسرے مذہب کی اہانت کے لیے ان کے بزدل دشمنوں نے رمزیت کے کون کون سے اسلوب اختیار کیے ہیں؟ موضوع اگرچہ اپنی جگہ بڑا اہم ہے اور اگر اس پر کوئی تحقیقی کام کیا جائے تو یہ مذہب اور ادب کی تاریخ میں بیش قیمت اضافہ ہوگا، لیکن یہاں ہم اختصار کے ساتھ اسلامی نام رکھنے والے اور مسلم معاشرے سے بھرپور فائدہ اُٹھانے والے اُن اعدائے دین کی کارستانیوں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو علامات کی آڑ میں اسلام کی توہین کرنے کے درپے ہیں۔ اسلام چونکہ پاکستان کی سب سے بڑی قوت ہے اور مسلم معاشرے سے وابستگی دُنیوی مفادات کے حصول کا ایک نہایت ہی مؤثر ذریعہ ہے، لہٰذا دینِ حق کے اِن بدخواہوں کو اس بات کی ہمت نہیں پڑتی کہ دین کے خلاف برملا اپنی دلی کدورت کا اظہار کریں یا جرأت سے کام لے کر کھلے بندوں اِس حقیقت کا اعتراف کریں کہ وہ اسلام کو سچا دین تسلیم نہیں کرتے اور اُن کا مسلم معاشرے سے کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ اِن پست ہمت دشمنانِ دین کے لیے دین سے بیزاری ظاہر کرنے کا ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے کہ وہ علامت و رمزیت سے کام لے کر اپنی خباثتِ نفس کا مظاہرہ کریں۔

'مولوی' وہ پہلی علامت ہے جس کے ذریعہ یہ بد باطن اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہیں۔ مولوی چونکہ دین کا علمبردار تصور کیا جاتا ہے، اس بنا پر یہ بد طینت لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر معاشرے میں اسے نکو بنا دیا جائے تو جس دعوت کا یہ داعی ہے وہ خود بخود عوام کی نظروں میں بے وزن ہو کر رہ جائے گی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلم معاشرے کے دوسرے طبقات کی طرح مولوی کا اخلاقی اور علمی معیار وہ نہیں رہا جو صدرِ اوّل میں تھا، لیکن اس امر کو ایک حد تک تسلیم کر لینے کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جس بے سروسامانی کے عالم میں اور مخالفتوں کے طوفانوں میں علما نے دین کی شمع کو کسی نہ کسی طرح فروزاں رکھنے کی جدوجہد کی وہ قابل ستائش ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جب دنیوی مفادات کے پجاری غیر ملکی سامراج کو اپنی دلی ہمدردیوں اور وفاداریوں کا یقین دلا رہے تھے تو اس وقت یہی "ملّا" انگریزی تسلط کے خلاف نہایت پامردی سے صف آرا تھا اور حصول آزادی کی پاداش میں یا تو حوالۂ زنداں کیا جا رہا تھا یا تختۂ دار پر لٹکایا جا رہا تھا۔ آپ ذرا پاک و ہند میں انگریز کی دو سو سالہ عملداری کی تاریخ کا مطالعہ کریں اور اس میں اس کے خلاف اٹھنے والی تحریکات کا تجزیہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان سب میں بیچارا "ملّا" ہی پیش پیش رہا اور سامراجی حکومت کے مظالم کا نشانہ بنتا رہا۔

اس "بدنام" ملّا نے نہ صرف انگریز کے سیاسی تسلط سے ہندوستان کو نجات دلانے کی سعی کی بلکہ مغرب کی تہذیبی یلغار سے اپنے ابنائے وطن بالخصوص مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کے لیے فکری اور عملی تدابیر اختیار کیں۔ ایک طرف تو اس نے انہیں مغربی تہذیب کے مضرت رساں پہلو سے آگاہ کیا اور دوسری طرف وطن کے گوشے گوشے میں دینی مدارس قائم کر کے مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات سے بہرہ ور کرنے کی کوشش کی اور اس طرح ان کے اندر خود اعتمادی پیدا کی۔ پاک و ہند کے مسلمانوں کی معاشرتی زندگی خصوصاً ان کی عائلی زندگی کے اسلامی تشخص کا مغربی تہذیب کی دست برد سے کافی حد تک محفوظ رہنا صرف علمائے دین کی گہری بصیرت اور ان کی عملی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔

اس "تنگ نظر" ملّا کے مقابلہ میں مفاد پرستوں نے، جو آجکل روشن خیالی کے علمبردار بنے پھرتے ہیں، اس ملک میں جو کردار ادا کیا ہے اسے کسی اعتبار سے کوئی قابلِ فخر کردار نہیں کہا جاسکتا۔ انہوں نے قوم کو

ایک ایسا طرزِ فکر دیا جس سے مغرب کی ذہنی غلامی کی راہ ہموار ہوئی اور پھر اِس غلامی کے نتیجے میں اُس کے سارے اخلاقی معیارات اور خوب و ناخوب کے پیمانے بدل کر رہ گئے اور "اُمّتِ وسط" میں سے ایک اچھی خاصی تعداد ایسے افراد کی اُبھر کر سامنے آئی جسے اپنے مسلمان ہونے پر نہیں، بلکہ غیر اسلامی افکار کے داعی ہونے پر ناز ہے۔ اِس طبقے کو غیر ملکی سامراج نے بھی دل کھول کر نوازا۔ انہیں حکومت کی "وفاداری" کے صلہ میں بڑی بڑی جاگیریں عطا کیں، اُنہیں نہایت اونچے مناصب پر فائز کیا گیا اور اِس طرح مسلم قوم کے اندر سے ایک ایسا طبقہ پیدا کر لیا جو اُس کی روایات اور اُس کے احساسات سے یکسر بیگانہ تھا، بلکہ ان سب کے بارے میں معاندانہ طرزِ فکر رکھتا تھا۔ مگر اِس طبقے کی عیاری ملاحظہ ہو کہ وہ اپنی فنکارانہ مہارت سے اُس گروہ کو رُسوا اور بدنام کرنے میں کامیاب ہوا ہے جو آج بھی اپنی ساری خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود شرعِ متین کا محافظ اور امین ہے۔ دین دشمن عناصر نے اُس کی اِس انداز سے تصویر کشی کی ہے کہ اُس کے نام کے ساتھ ہی ایک ایسے دقیانوسی، رجعت پسند، تنگ نظر اور عقل و فکر سے عاری شخص کا تصور سامنے آجاتا ہے جو مسلم معاشرے کے مفاد کا سب سے بڑا دشمن ہے۔

مُلّا کی شخصیت کو ذلیل کرنے کے لیے ان ظالموں نے اُن شعائرِ دین کی تذلیل کا بھی اہتمام کیا جنہیں اللہ تعالیٰ اور اِس کے رسولؐ نے ہر مسلمان کے نزدیک واجب الاحترام ٹھیرایا ہے لیکن جو بدقسمتی سے صرف مولوی کے ساتھ مختص ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان میں نمایاں مثال ڈاڑھی کی ہے۔ ہر وہ شخص جو اسلام کا معمولی علم بھی رکھتا ہے اِس حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہے کہ ڈاڑھی حضور سرورِ دو عالم کی سنّت ہے اور اِسی وجہ سے اُسے صحابہؓ، تابعینؒ، تبع تابعینؒ اور اُمّت کے سارے علماء، صلحاء اور اتقیاء نے نہ صرف خود رکھا بلکہ اِس کے رکھنے پر زور دیا۔ اب جو شخص اُس کا مذاق اُڑاتا ہے وہ درحقیقت اس مقدس ذات کی توہین کرتا ہے جس کی یہ سنّت ہے۔ مگر ہمارے ہاں دین سے غافل لوگ صبح شام اِن پر پھبتیاں کستے رہتے ہیں اور اِس کا ذکر اِس مکروہ انداز میں کرتے ہیں گویا جس شخص کے چہرے پر اسلام کی یہ علامت موجود ہے وہ جاہل، بیوقوف اور وقت کے تقاضوں سے یکسر نابلد ہونے کی بنا پر ایک اضحوکہ ہے جس کا جتنا بھی مذاق اُڑایا جائے کم ہے۔

یہ استہزاء صرف داڑھی ہی تک محدود نہیں ہوتا، بلکہ اس کی زد میں مولوی کا لباس اور اس کے اطوار بھی آجاتے ہیں۔ سادہ لوح لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس استہزاء سے شعائرِ دین کی توہین مقصود نہیں ہوتی، بلکہ یہ ایک خاص طبقہ کے چند تاریک خیال افراد کی بعض بھونڈی عادات پر ایک لطیف سی طنز ہوتی ہے تاکہ وہ اِن پُرانی عادات کو ترک کر کے نئے سانچوں میں ڈھلنے کی کوشش کریں۔ مگر یہ دین سے بیزاری پھیلانے والی تحریک کا نہایت ہی سطحی مطالعہ ہے۔ بھولے بھالے لوگ یہ رائے قائم کرتے ہوئے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ جن اطوار کو وہ بھونڈی عادات کہہ کر اُن کی اہمیت کم رہے ہیں وہ اسلامی تہذیب و تمدن کے مخصوص مظاہر ہیں جو زندگی کے بارے میں خدا پرستانہ طرزِ فکر کے ترجمان ہیں۔ یہ اِس بات کی واضح شہادت فراہم کرتے ہیں کہ جس تہذیب نے اُنہیں سوچنے اور حالات کو سمجھنے کا ایک مخصوص انداز دیا ہے، اُس نے انہیں لباس و آرائش کا ایک خاص ذوق بھی عطا کیا ہے۔ اِس بنا پر انسان کے ذوق کا اُس کے بنیادی عقیدہ سے نہایت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ انسان کو جس ذات سے محبت اور عقیدت ہوتی ہے وہ نہ صرف اُس کے افکار و نظریات کو قبول کرتا ہے بلکہ اس کے اطوار کو بھی امکانی حد تک اپناتا ہے اور یہ اُس کے اخلاص کی سب سے بڑی شہادت سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ وہ لوگ جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کے دعویدار ہیں اور ایمان کی اس دولت کو دُنیوی فلاح اور اخروی کامرانی کی واحد کلید تصوّر کرتے ہیں، وہ اپنے ایمان کے تقاضے کے تحت ہی اپنے دل میں اس شدید اُمنگ کو بھی پالتے ہیں کہ جہاں وہ ہادیٔ برحق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معتقدات پر دل و جان سے یقین رکھنے والے ہوں، وہاں وہ حضورؐ کی سنت کے بھی پوری طرح متبع ہوں اور یہ اتباع اِس لگن اور خوشدلی کے ساتھ کریں کہ اُن کا ذوق حضور سرورِ دوعالمؐ کے ذوق کے یکسر تابع ہو کر رہ جائے۔ اِس حقیقت کو خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہے:

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ	تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہش اس بات کے تابع نہ ہو جائے جو میں لایا ہوں۔
(شرح السنۃ)	

اِسی طرح حضور سرورِ دوعالمؐ کے خادمِ خاص حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آپ نے ایک مرتبہ مخاطب ہو کر فرمایا:

مَنْ اَحَبَّ سُنَّتِیْ فَقَدْ اَحَبَّنِیْ ، وَمَنْ اَحَبَّنِیْ کَانَ مَعِیَ فِی الْجَنَّۃِ ۔

جس نے میری سنت سے محبت کی اس نے گویا مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی تو وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا

اگر حضور سرورِ دو عالمؐ کی سنت سے محبت کسی شخص کے صاحبِ ایمان ہونے کی سند اور جنت کی بشارت ہے تو اُس سنت کے کسی ایک پہلو کی جان بوجھ کر بے حرمتی اور اُس کا استہزا ایمان سے محرومی اور اُخروی خسران کا موجب بھی ہے۔ جو بدبخت سنت کی تذلیل کے درپے رہتا ہے، وہ درحقیقت اُس ذاتِ اقدسؐ کے خلاف دل میں بغض رکھتا ہے جس کی وہ سنت ہے کیونکہ اس بدباطن کو ایسا کرنے میں لطف محسوس ہوتا ہے۔ وہ چونکہ معاشرتی دباؤ کی وجہ سے کھل کر اپنے اس بغض کا اظہار نہیں کرسکتا اس لیے سنت پر طنز کے ذریعہ اپنے دل کے پھپھولے پھوڑتا رہتا ہے اور لوگوں کو یہ باور کراتا ہے کہ وہ روشن خیالی کا پرچار اور قدامت پرستی کے خلاف جہاد کر رہا ہے، درآنحالیکہ وہ اسلامی تعلیمات کے خلاف نفرت و حقارت کا جذبہ پھیلانے میں مصروف ہوتا ہے۔ جب ایسے دریدہ دہن کو اُس کی اِس مذموم حرکت پر ٹوکا جاتا ہے تو وہ بڑے معصومانہ انداز میں جواب دیتا ہے کہ شعائرِ دین پر طنز سے اُس کا مقصد اُن کی تحقیر نہیں، وہ تو محض خوش طبعی کی خاطر ایسا کر رہا ہے۔ اور اگر بدقسمتی سے شعائرِ دین کی توہین کرنے والا ادیب اور شاعر ہوا اور وہ اپنی ادبی دلچسپیوں سے بڑھ کر زندگی کے بارے میں اپنے کچھ ایسے نظریات بھی رکھتا ہو جو اسلامی افکار سے مختلف ہوں تو وہ اپنے خبثِ باطن کو یہ کہہ کر چھپاتا ہے کہ شعائرِ دین پر اس کی طنز کا مقصد دین کی تذلیل نہیں بلکہ اس سے اُن افراد کے کردار پر حرف گیری مقصود ہے جنہیں لوگ دین کے علمبردار سمجھتے ہیں۔ کس قدر اُلٹی منطق ہے یہ کہ اُنہیں جائز یا ناجائز شکایت تو چند داعیانِ دین کے بعض افعال و اعمال سے ہے اور اس کی وجہ بھی ہے کہ یہ ناقدین اُن کے اِن افعال کو اسلامی تعلیمات کے مطابق نہیں پاتے، لیکن جب زبانِ طعن کھولنے کی باری آتی ہے تو وہ شعائرِ دین کے خلاف کھولی جاتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ دین کے اِن "مصلحین" کو دیندار طبقے کی خامیوں کی اصلاح مقصود نہیں ہوتی، بلکہ اُن کی تذلیل مدِنظر ہوتی ہے تاکہ معاشرے میں اُن اقدار کی بے حرمتی ہو جن کے وہ امین تصور کیے جاتے ہیں۔ آخر یہ بات کس منطق کی رُو سے درست ہے کہ اسلام کے اِن "خیرخواہوں" (باقی بر صفحہ ۴۸)

دعوتِ اسلامی کے مطالبات

اپنے کارکنوں سے

مولانا صدر الدین اصلاحی

دنیا کی ہر تحریک اپنا ایک خاص نصب العین، ایک متعین منزلِ مقصود اور ایک آخری ہدف رکھتی ہے اور جس نوعیت کا یہ نصب العین ہوتا ہے اسی نوعیت کی فکری اور عملی صفات رکھنے والے کارکن بھی اُسے درکار ہوتے ہیں۔ یہ کارکن کسی بھی تحریک کی اوّلین ضرورت ہوا کرتے ہیں کیونکہ تحریکوں کی کامیابی جن باتوں پر موقوف ہوا کرتی ہے ان میں سب سے پہلا مقام ایسے ہی کارکنوں اور ان کی انہی صفات کو حاصل ہے۔ واضح تر لفظوں میں یہ کہ اپنے کارکنوں کی یہی صفات تحریک کا اصل سرمایہ ہوا کرتی ہیں۔ اچھی سے اچھی تحریکیں بھی کس مپرسی اور نامرادی کا شکار ہو کر دم توڑ دیا کرتی ہیں اگر ان کے پاس حیات و بقا کا یہ سرمایہ موجود نہ ہو اور نامعقول سے نامعقول تحریکیں بھی قوموں اور مملکتوں کو مسخر کر لیتی ہیں، اگر ان کے علمبردار اور کارکن ضروری صفات اور صلاحیتوں سے مسلح ہوں۔ جہاں تک دینی دعوتوں اور اسلامی تحریکوں کا تعلق ہے معلوم رہنا چاہیے کہ یہ اصول یا یہ قانونِ قدرت ان کے احترام میں کچھ نرم نہیں پڑ جاتا بلکہ شاید کچھ اور سخت ہی ہو جاتا ہے۔ اُن کے لیے زندگی اور کامیابی کی راہیں اُسی وقت ہموار ہو سکتی ہیں جب ان کے کارکن فکر و عمل کے ایک خاص سانچے میں پوری طرح ڈھلے ہوئے ہوں۔ کسی اسلامی تحریک کے اردگرد لوگوں کی کتنی ہی بڑی بھیڑ کیوں نہ اکٹھی ہو جائے لیکن ان کے پاس اگر وہ نگاہ نہ ہو جو ایک داعیِ حق کی نگاہ ہوتی ہے، نہ وہ دل ہو جو ایک سچے مومن کے سینے میں پایا جاتا ہے تو یہ جمِّ غفیر اس کے لیے کسی خیر کا موجب ہرگز نہیں بن سکتا ہے۔ ایسی تحریکوں کا مقدر یا تو سسک سسک کر دم توڑ دینا ہوتا ہے یا ایسی وادیوں میں جا بھٹکنا جن میں سے ہو کر گزرنے والی کوئی راہ بھی احیائے اسلام اور اقامتِ دین کی منزل تک پہنچانے والی نہیں ہوتی۔

جس چیز کی اتنی اہمیت ہو، جس کے وجود اور عدم کے معنی تحریکوں کی زندگی اور موت کے ہوں اُس کے بارے میں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اُسے پوری طرح واضح اور اس کی اہمیت سے اچھی طرح واقف اور آگاہ رہنا چاہیے۔ آیئے ہم جائزہ لے کر دیکھیں کہ وہ صفات کون سی ہیں جن پر کسی فرد کا داعیِ حق ہونا اور کسی اسلامی تحریک کا کامیاب ہونا موقوف ہے۔

اس سوال کا چند لفظی جواب تو یہ ہے کہ یہ صفات بلا کم و کاست وہی ہیں جو ایک سچے مسلمان اور قرآن کے مردِ مومن میں پائی جانی چاہییں۔ ان صفات کی پوری تفصیلات خدا کی کتاب اور رسولِ خدا کے ارشادات میں موجود ہیں اور ان کی عملی شرح اُن داعیانِ حق کا عمل کرتا ہے جنہیں دنیا حواریین اور اصحابِ رسولؐ کے نام سے جانتی ہے۔ ان صفات کی تفصیل چونکہ کافی طویل ہے اور ان سب کی تفصیل کے لیے پورا ایک دفتر بھی کفایت نہیں کر سکتا، اس لیے اس مختصر مضمون میں صرف چند منتخب اور بنیادی صفات ہی پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے لیکن یہ منتخب صفات ایسی ہوں گی جو نہ صرف یہ کہ بجائے خود بنیادی اور غیر معمولی اہمیت کی مالک ہیں بلکہ باقی دوسری صفات کے لیے بھی سرچشمۂ حیات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس لیے ان چند صفات کی وضاحت اور یاددہانی یقیناً اُن ساری صفتوں کی وضاحت اور یاددہانی کی ہم معنی ہوں گی جن کا مطالبہ دعوتِ اسلامی اپنے کارکنوں سے کرتی ہے۔

ان بنیادی اور غیر معمولی طور پر اہم صفات میں سے کچھ کا تعلق تو فکر و نظر سے ہے اور کچھ کا سیرت و کردار سے۔ یہاں مناسب ہوگا کہ پہلے ان صفات کو لیا جائے جو فکری نوعیت کی ہیں۔

نصب العین کا یقین

پہلی صفت جس کا دعوتِ اسلامی کے علمبرداروں اور کارکنوں میں پایا جانا از بس ضروری ہے، اپنے نصب العین کے بارے میں ذہن کی مکمل یکسوئی اور قلب کا پورا اطمینان ہے۔ ایسی یکسوئی جسے حالات کا کوئی دباؤ درہم برہم نہ کر سکے اور ایسا اطمینان جو ہر آن تازہ و توانا رہے اور ماحول کی کوئی ترغیب اور وقت کی کوئی مصلحت اُسے متاثر نہ کر سکے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ کسی دعوت کو برحق اور اس کے نصب العین کو اپنا نصب العین تسلیم کر لینا اور بات ہے اور انہیں پورے شرحِ صدر کے ساتھ برابر تسلیم کیے رہنا بالکل دوسری بات ہے۔ کسی بھی ذہنی فیصلے اور قائم کیے ہوئے یقین کے بارے میں یہ اطمینان نہیں رکھا جا سکتا کہ اب وہ کبھی بے یقینی یا کم یقینی سے بدل نہ سکے گا۔ بلاشبہ انسان اللہ کے دین کی نصرت اور اقامت کو اپنا فریضۂ حیات قرار دینے کا فیصلہ پورے اخلاص اور عزم سے کرتا ہے مگر ساتھ ہی ایسے عوامل

بھی اس کی آنکھوں کے سامنے آتے ہیں جو اسے اس نصب العین کی طرف سے شک اور تردد میں مبتلا کر دینا چاہتے ہیں۔ ان کی اس کوشش کی کامیابی کے امکانات سب سے زیادہ اُس وقت ہوتے ہیں جب دعوت مسلسل بے توجہی اور نامقبولیت کے دَور سے گزر رہی ہو۔ اس کی آواز ماحول کے لیے یکسر نامانوس اور اس کے ماننے والے بس خال خال ہوں۔ اس حقیقت کا سراغ ہمیں خود قرآنی دعوت کی سرگذشت میں بھی ملتا ہے۔ قرآن مجید کی ان ہدایات کا غور سے جائزہ لیجیے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے آپ کے اصحاب کو دی گئی تھیں:۔

"یہی حق ہے تمہارے رب کی جانب سے، پس تم ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہو جانا۔"

(البقرہ۔ ۱۴۷)

"پس اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر تمہیں اُس چیز کے بارے میں کوئی شک ہو جسے ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے تو اس کے متعلق ان لوگوں سے پوچھ لو جو تم سے پہلے سے کتاب الٰہی پڑھتے ہے ہیں۔ یقیناً یہ حق تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے آیا ہے تو تم ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہونا۔" (یونس۔ ۹۴)

ان ہدایات اور تنبیہات کے پس منظر میں واضح طور پر ردّ و انکار بھری وہ فضا تھی جو دعوتِ قرآنی پر ایک مدت تک چھائی رہی تھی۔ یہ ہدایات بتاتی ہیں کہ اگر سورج جیسی روشن حقیقت کا بھی ہر طرف سے انکار کیا جا رہا ہو اور اس انکار میں عوام و خواص، اپنے اور بیگانے، واقف اور ناواقف سبھی شریک ہوں تو آدمی کو بسا اوقات خود اپنی آنکھوں پر شبہ ہوتا ہے۔ حضرات صحابہ کرام کو یہ ہدایتیں ایسے ہی حالات میں اور انسانی نفسیات کے اِسی پہلو کے پیش نظر دی گئی تھیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ جب اصحاب کرام جیسے ایمان و یقین کے پیکر بھی اس امکان سے یکسر بالاتر نہ تھے کہ فضا کی تاریکی ان پر شک و تردد کی پرچھائیاں ڈال دے، حالانکہ وحی الٰہی کے انوار وہ براہ راست اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، تو آج ایمان و یقین کے اس دورِ زوال میں اِس امکانی اندیشہ سے کیسے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ صورتِ حال اس وقت یہ ہے کہ مغرب کی مادی تہذیب پوری قوت کے ساتھ دنیا پر مسلّط ہے۔ انسانیت کا قافلہ چار و ناچار اسی کی قیادت میں سفر کر رہا ہے اور اسی کے بطن سے نکلے ہوئے نظام مغرب اور مشرق میں ہر طرف قبولِ عام حاصل کیے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف اسلام کے پیروؤں کا اپنا حال بالعموم یہ ہے کہ ان کے لیے وہ دین نظری

طور پر بھی پوری طرح مانوس نہیں رہ گیا ہے جس کی وضاحت خدا کی کتاب اور رسولِ خدا کی سنت کرتی ہے اور جہاں تک عمل و اتباع کا، اس دین کی مکمل پیروی اور اقامت کا سوال ہے اسے تو گویا بڑی حد تک عملاً فراموش ہی کر دیا گیا ہے اور اگر کہیں اس کا احساس کروٹ لیتا بھی ہے تو خوشنما تاویلات اور رنگا رنگ توجیہات کا سحر اسے پھر گہری نیند سلا دیتا ہے حتیٰ کہ اس طرح کے اقدامات کو عاقبت نااندیشی اور بے دانشی ٹھیرا دینے میں بھی تامل نہیں کیا جاتا۔ ایسے ناسازگار اور حوصلہ شکن حالات میں دعوتِ اسلامی کے نصب العین پر اپنے یقین کی شمع کو روشن رکھنا کوئی آسان بات نہیں۔ یہ دراصل طوفانی سمندر میں اپنے حواس کو مجتمع رکھنے اور اپنی چھوٹی سی کشتی کو موجوں اور چٹانوں سے محفوظ بچا لے جانے کی مردافگن مہم ہے۔ دعوت اسلامی کے ہر کارکن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس مہم سے آگاہ بھی رہے اور اسے کامیابی سے سر کرنے کے لیے تیار بھی رہے۔

موقف کی استقامت دوسرا ضروری اور بنیادی وصف جس پر داعیانہ زندگی کی بنا موقوف ہے، فکر و نظر کی صلابت اور موقف کی استقامت ہے۔ دعوتِ اسلامی کا حق ادا اسی وقت ہو سکتا ہے جب اس کے علمبردار اس کے اصولوں میں کسی ترمیم اور کسر و انکسار کے بالکل روادار نہ ہوں، دین کی اقامت کی سیدھی شاہراہ پر قدم مضبوطی سے جمائے چل رہے ہوں اور اپنے موقف کے کھلے ہوئے تقاضوں کو زمانہ کی کسی ترغیب اور دعوتِ مصالحت پر قربان نہ کریں۔ اس سلسلہ میں اس ابدی حقیقت کو کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ اس دین کا اور اس دعوت کا مزاج ہی مصالحت ناآشنا نہیں ہے بلکہ اس کی کامیابی کا انحصار بھی مصالحانہ رویہ سے یکسر گریز پر ہے۔ مصالحت سے میری مراد یہاں وہ مصالحت نہیں ہے جو ایمان کی کمزوری اور ہمت کی پستی، دنیا کی محبت اور مفادات کی کشش کا نتیجہ ہوا کرتی ہے کیونکہ ایسی دنائت کا اندیشہ دعوتِ حق کا علم اٹھانے والوں سے رکھا ہی نہیں جا سکتا۔ ان کے بارے میں اندیشہ اگر کیا جا سکتا ہے تو صرف اس مصالحت کا جو دنیا اور نفس کی خاطر نہیں بلکہ کم نظری کی بنا پر خود دعوتِ حق ہی کے مفاد کی خاطر کر لی جائے جس کی بنیاد نیت کے کھوٹ اور نفس کی اکساہٹ پر نہیں بلکہ اپنے ارادے کی حد تک حسنِ نیت اور جذبۂ خیر ہی پر ہو۔ اس خطرے کا امکان اس وقت پیدا ہوتا ہے جب داعی کے ذہن میں یہ خیال گردش کرنے لگے کہ اگر دین و ایمان کے بے لچک اصولوں میں اس وقت عارضی طور پر تھوڑی سی لچک پیدا کر لی جائے تو ایک طرف دعوت کے خلاف اٹھنے والا طوفان تھم جائے گا۔ دوسری طرف دعوت کے لیے ترقی اور مقبولیت کی راہیں بھی کھل جائیں گی۔

جیسا کہ ابھی عرض کیا جا چکا ہے، یہ انداز فکر کسی مرعوب اور فراری ذہنیت کی پیداوار نہیں ہوتا، بلکہ اپنے شعور کی حد تک خود نصب العین ہی کے مفاد کی خاطر اختیار کر لیا جاتا ہے اور اس کا محرک اہل دعوت کی وہ حرص ہوتی ہے جسے وہ دعوت کے فروغ کے سلسلے میں فطری طور پر رکھتے ہیں۔ اس حرص کے غیر معمولی دباؤ میں جب ان کی فکری استقامت اور دُور بینی پر عجلت پسندی اپنا سایہ ڈال دیتی ہے تو سوچنے کا یہ انداز وجود میں آجاتا ہے اور اس طرح خود خیر پسندی کے نام پر خیر کی حقیقی منزل کا سراغ گم ہونے لگتا ہے۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ حق کی راہ مار دینے والے فتنوں میں یہ سب سے زیادہ خطرناک فتنہ ہے۔ یہ ایسا دام ہمرنگ زمین ہے جس سے محفوظ رہنا ایمان کی فراست اور فکر و نظر کی استقامت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ بات اچھی طرح سمجھ میں آجائے گی اگر کسی اور کی نہیں خود سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلّم کی دعوتی سرگذشتوں پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ آپ کو اپنے مختلف دعوتی مراحل میں جن حالات سے سابقہ پیش آیا ان میں سے ایک خاص صورت حال کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا تبصرہ قرآن کے اندر ان لفظوں میں موجود ہے۔

"قریب تھا کہ یہ لوگ تمہیں فتنہ میں مبتلا کر کے اُس ہدایت کی طرف سے پھیر دیں جس کی ہم نے تم پر وحی کی ہے تاکہ تم ہماری طرف اُس کے سوا کچھ اور ہی باتیں منسوب کر دو۔ اس وقت یہ لوگ تمہیں اپنا گہرا دوست بنا لیتے اور اگر ہم تمہیں ثابت قدم نہ رکھتے تو کچھ نہ کچھ ان کی طرف تم ضرور جھک پڑے ہوتے۔" (اسرٰی)

اس تبصرہ کے الفاظ خود بتاتے ہیں کہ اس کا تعلق اُسی طرح کی صورت حال سے تھا جو اِس وقت زیر بحث ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب مخالف کیمپ کو محسوس ہو گیا تھا کہ اب کوئی بھی متشددانہ کارروائی اس دعوت کو آگے بڑھنے سے روک نہیں سکتی۔ اس وقت مخالفین نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ اپنا محاذ جنگ بدل دینا چاہا، ظلم و تشدد کی جگہ صلح و مصالحت کی تدبیروں سے کام نکالنے کی کوشش کی، پیش کش کی گئی کہ اس دعوت کو تھوڑا سا معتدل بنا دیا جائے تو ہم بھی اپنی مخالفانہ سرگرمیاں بند کر دیں گے۔ اس پیش کش نے جیسا کہ " لقد کدت ترکن الیھم شیئاً قلیلا " کے الفاظ بتاتے ہیں، آپ کو ایک طرح کی اُلجھن میں مبتلا کر دیا۔ ایک طرف تو رسالت کی ذمہ داریوں کا تقاضا یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ بھی آیا ہے اُسے اس کے بندوں تک بلا کم و کاست پہنچا دیا جائے اور اس میں کسی بھی مصلحت کی خاطر ذرہ برابر ترمیم نہ کی جائے۔ دوسری طرف اپنی قوم کے ایمان کے بارے میں آپ کی حد سے بڑھی ہوئی تمنا تھی جس کی بنا پر آپ ہر اُس ممکن تدبیر اور مناسب موقع سے فائدہ اُٹھانے پر آمادہ رہا کرتے تھے جس سے اس

پاک آرزو کے بر آنے کی توقع ہوتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی اس پیش کش سے آپ یک گونہ تردد میں پڑ گئے اور یہ محض اللہ کی غیبی حفاظت تھی جس نے آپ کو اس ترددِ محض کی حالت سے آگے نہ بڑھنے دیا اور آپ کے قدموں کو حق کے موقف پر مضبوطی سے جمائے رکھا۔

خیر نما شر

سوچیے اور بار بار سوچیے کہ خیر کا جامہ پہن کر نمودار ہونے والا یہ شر کتنا خطرناک ہے اور ہم جیسے کمزور انسانوں کو اس کے حملے سے بچے رہنے کے لیے کتنی ہوشمندی اور کتنی دعاؤں کی ضرورت ہے؟ اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق اور حفاظت کے بغیر پیغمبر کے لیے اس کے بچھائے ہوئے جال سے دھوکا کھا جانے کا امکان ہو سکتا تھا تو آج ہم اس کی طرف سے بے فکر اور مطمئن کیسے رہ سکتے ہیں۔ پس دعوت اور اس کے کارکن اس امر کے سخت محتاج ہیں اور برابر رہیں گے کہ ان کے دل و دماغ اس خیر نما شر سے اپنے آپ کو بچائے رکھنے کا پورا اہتمام رکھیں اور ان کے موقف میں کوئی کمزوری نہ آنے پائے۔

اس اہم انسانی صفت کی کیفیتِ مطلوب جس کی اس وقت یاد دہانی کرائی جا رہی ہے، پوری طرح سمجھ میں آ جائے گی اگر دعوتِ محمدی کے ایک ناقابلِ فراموش واقعہ کو سامنے رکھ لیں جو مکی دور میں پیش آیا تھا۔ قریش نے ابوطالب کے توسط سے آپ کے سامنے یہ مصالحانہ پیش کش رکھی کہ آپ اپنے دین اور اپنے عقیدۂ توحید کی تبلیغ جس طرح چاہیں کرتے رہیں مگر ہمارے عقائد کی تردید سے صرفِ نظر کر لیں، ہم آپ کے قدموں میں دولت کا انبار ہی نہیں لگا دیں گے بلکہ اپنا حکمران بھی تسلیم کر لیں گے۔ کوئی شبہ نہیں کہ ایک عام انسان کے نقطۂ نگاہ سے یہ پیش کش انتہائی پرکشش تھی۔ وہ اِسے کسی ذاتی مفاد کی خاطر نہیں بلکہ عین اپنی دعوت کے مفاد کے لیے ایک خداداد موقع سمجھ سکتا تھا۔ مصلحت شناسی اسے سمجھا سکتی تھی کہ اس ملنے والے اقتدار سے کام لے کر میں اپنی دعوت کو بڑی آسانی اور تیزی کے ساتھ آگے بڑھا سکوں گا اور یہ سوچ کر وہ اس پیش کش کو لپک کر قبول کر لیتا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس پیش کش کے جواب میں آنحضرتؐ نے کیا فرمایا؟ یہ فرمایا کہ "خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند لا کر رکھ دیں جب بھی میں اپنی دعوت اور دعوتی سرگرمیوں سے باز نہ آؤں گا" ہمارا ایمان ہے کہ یہ جواب جوش اور تمکنت کا جواب نہ تھا بلکہ پیغمبرانہ بصیرت کا جواب تھا۔ اس حقیقت شناسی کا جواب تھا کہ حق کی دعوت اگر صرف ایجابی پہلو تک محدود رکھی گئی تو وہ اپنی اصل معنویت برقرار نہ رکھ سکے گی اور باطل سے مصالحت کرنا دراصل اپنی دعوت کے قتل نامے پر دستخط کر دینا ہے۔

ضرورت ہے کہ دعوت کے علمبردار اس سبق کو بھی ہمیشہ یاد رکھیں جو قریش کی اس پیش کش سے ملتا ہے اور حق کی فطرت کے اس تقاضے کو بھی ذہن نشین رکھیں جو اللہ کے رسولؐ کے اس جواب سے واضح ہوتا ہے۔
آج کے حالات میں اس عزم و احتیاط کی ضرورت کچھ کم نہیں ہو گئی ہے بلکہ کچھ بڑھ ہی گئی ہے کیونکہ اب ان کی نوعیت بڑی پیچیدگی اختیار کر گئی ہے۔ دورِ نبوت میں معاملہ اسلام کے کھلے ہوئے منکروں اور مخالفوں سے تھا مگر آج سابقہ غیروں اور اپنوں سبھی سے ہے۔ مخالفوں کی دعوتِ مخالفت کا بھانپ لینا پھر بھی آسان ہوتا ہے مگر اپنوں کے مصالحانہ مطالبات سے عہدہ برآ ہونا بڑا مشکل اور نازک مسئلہ ہے۔
آج فکر و عمل کے متعدد دھارے بہہ رہے ہیں۔ کوئی وطنی ہے کوئی قومی، کوئی ملّی ہے اور کوئی تہذیبی اور معاشی۔ اور ان میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ سب اس میں آشامل ہوں۔ یہ مختلف دھارے دوسروں کی طرح دعوتِ اسلامی اور اس کے کارکنوں سے بھی انضمام کا یہ مطالبہ کر سکتے ہیں اور بسا اوقات بڑے مؤثر دلائل کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ اُن کی ایمانی فراست اور فکری استقامت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ایسے وقت میں اپنے موقف پر کوئی حرف نہ آنے دیں۔ اُن کے موقف کا تقاضا ان مقبولِ عام دھاروں میں خود بھی جا شامل ہونا نہیں ہے بلکہ اُن کے رُخ کو موڑ دینا ہے۔ یہ صرف دعوتی رُوح کا ہی تقاضا نہیں ہے بلکہ خود ملک اور ملّت کے ساتھ سچی وفاداری اور حقیقی بہی خواہی کا بھی یہی تقاضا ہے۔

صبر اور مستقل مزاجی

تیسری اہم صفت صبر اور مستقل مزاجی کی ہے۔ داعی کے قلب کو اتنا مضبوط ہونا چاہیے کہ حالات کی کوئی ناسازگاری اس کے عزم کو مفلوج نہ کر سکے۔ یہ ناسازگاریاں بنیادی طور پر دو قسم کی ہوتی ہیں۔ پہلی قسم میں وہ مشکلات اور مصائب شامل ہیں جو دعوتی فریضہ کی انجام دہی کی وجہ سے پیش آئیں۔ دوسری قسم اس ناسازگاری کی ہے جو دعوت کی ظاہری ناکامی کی شکل میں سامنے آئے۔
جہاں تک مصائب و مشکلات کا تعلق ہے، ان کا راہِ حق میں پیش آنا اللہ کے قانونِ آزمائش نے ہمیشہ سے مقدر کر رکھا ہے اور ان سے کترا کر نکل جانا کسی مخلص داعی گروہ یا فرد کے لیے ممکن ہی نہیں۔ اللہ کے اس قانونِ آزمائش کے پیچھے جو حکمتیں کام کر رہی ہیں اور جس طرح کی آزمائشیں اہلِ حق کو پیش آتی ہیں، ان کی تفصیل قرآن کے اوراق میں ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔ یہاں میں آپ کی توجہ صرف اس امر کی طرف مبذول کرانے پر اکتفا کروں گا کہ یہ قانونِ آزمائش بدستور نافذ ہے اور آج بھی دعوت اقامت دین کا راستہ خارزاروں ہی سے ہو کر گذرے گا۔ اس لیے جو لوگ اس کام کے لیے آگے بڑھے ہوں ضروری ہے کہ ان کے اندر

بہت کچھ جھیل جانے کا ہوتا ہو، وہ چوٹیں کھا کر اگر مسکرا نہ سکیں تو کم از کم اتنا ضرور ہو کہ کراہ کر بیٹھ بھی نہ جائیں۔ وہ اگر زمانہ کے حوادث کو حقارت سے ٹھکرا نہ سکیں تو کم از کم ایسا تو بہر حال ہو کہ اُن کے آگے سپر انداز بھی نہ ہو جائیں۔

یہ بات کسی وضاحت کی محتاج نہیں کہ انسان کے اندر یہ طاقتِ برداشت ضرور پیدا ہو کر رہتی ہے اگر وہ اپنے عہدِ بندگی میں مخلص ہو، جانتا ہو کہ یہ تھوڑا بہت کھونا بہت کچھ پانے کے لیے کر رہا ہے۔ اس کے شعور پر فلاحِ آخرت کی طلب پوری طرح چھائی ہوئی ہو اور سمجھتا ہو کہ اللہ کی رضا کتنی بیش قیمت چیز ہے۔

جس طرح داعی کو مصائب اور مشکلات سے ہار نہیں ماننا چاہیے اسی طرح اسے دعوت کی ظاہری ناکامیوں سے بددل اور شکستہ دل بھی نہ ہونا چاہیے بلکہ نتائج کی پروا کیے بغیر اپنے کام میں برابر لگے رہنا چاہیے۔ بلاشبہ فطرتِ بشری یہی ہے کہ آدمی اپنی کوششوں کو کامیاب دیکھ کر مزید تیز گام ہو جاتا ہے اور انہیں ناکام پا کر حوصلہ ہار بیٹھتا ہے۔ لیکن یہ بشری فطرت کا خاصہ ہے۔ ایمانی اور دعوتی فطرت کا نہیں۔ ایمانی اور دعوتی فطرت تو یہ ہے کہ انسان ظاہری کامیابیوں اور ناکامیوں سے بلند رہے، اور اللہ کے بندوں تک اس کا پیغام اعلان کے ساتھ بھی اور اسرار کے ساتھ بھی، حکمت اور موعظت کے ساتھ بھی اور جدالِ احسن کے ساتھ بھی، ہر ممکن طریقہ اور تدبیر سے برابر پہنچاتا ہی رہے۔ اگر اس کی آواز کے لیے دلوں کے دروازے نہ کھل رہے ہوں تو یہ صورت حال اس کے لیے بددل اور خاموش ہو رہنے کا نہیں بلکہ مزید اضطراب کا موجب بن جائے۔ وہ ہمیشہ یاد رکھے کہ اس کی دعوت جن دعوتوں کی صدائے بازگشت ہے ان کے اولوالعزم سربراہوں نے اس کے لیے یہی اُسوہ چھوڑا ہے۔ چنانچہ یہ قرآن پاک ہی کا بیان ہے کہ اللہ کے ایک پیغمبر نے سال دو سال نہیں پورے ساڑھے نو سو برس اس مجاہدے میں گزارے تھے۔ یہ مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا بیان ہے کہ کتنے ہی پیغمبر ایسے گزرے ہیں جن کی دعوت پر لبیک کہنے والوں کی تعداد چند سے زیادہ نہ تھی اور بعض پر ایمان لانے والے بس ایک ہی دو تھے۔ حتیٰ کہ بعض ایسے بھی تھے جو زندگی بھر لوگوں کو حق کی طرف بلاتے رہے اگرچہ ایک شخص نے بھی ان کی سُن کر نہ دی۔ حضرات انبیاء کرام کی تاریخِ دعوت و عزیمت کے یہ صفحات اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھا دینے کے لیے بالکل کافی ہیں کہ حق کا داعی دعوت کی ظاہری ناکامی سے چاہے جس قدر بھی متفکر اور مضطرب ہو مگر وہ مایوس اور بددل

ہو کر خاموش بیٹھ نہیں رہتا۔ یہ اس لیے کہ دعوت کی ظاہری ناکامی، داعی کی اپنی ناکامی کی ہم معنی ہرگز نہیں ہے۔ اس کے برخلاف یہ عین ممکن ہے کہ دعوت کی سو فیصد ناکامی کے باوجود داعی اپنی اصل غایت مقصود کے لحاظ سے سو فیصد کامیاب رہے۔ کیونکہ اس کی اصل غایت مقصود لوگوں کے اندر ایمان کا اُتار دینا اور زمین کے اوپر نظام حق کا قائم کر دینا نہیں ہے بلکہ اللہ رب العالمین کی خوشنودی اور آخرت کی خوش انجامی کا حاصل کر لینا ہے اور یہ وہ مقصد ہے جو ایمان کے تقاضوں اور دعوتی جدوجہد کا حق ادا کر دینے کے بعد لازماً حاصل ہو جاتا ہے خواہ اس جدوجہد کا کوئی ظاہری نتیجہ نکلے یا نہ نکلے۔ یہ ایک ایسی مسلّمہ حقیقت ہے کہ جس سے کوئی بھی صاحبِ ایمان بے خبر نہیں ہو سکتا۔ اور ایک داعی کے مایوسی اور دل شکستگی سے بچے رہنے اور پوری مستقل مزاجی سے دعوتی فرائض انجام دیتے رہنے کے لیے ضروری ہے کہ دعوت کے کارکنوں کا ذہن اس بارے میں بالکل صاف رہے۔ وہ اس یقین کے ساتھ اللہ کے بندوں کو اللہ کے دین کی طرف بلائیں اور بلاتے رہیں کہ ان کی ہر جدوجہد ایسی جدوجہد ہے جس میں نامرادی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

خلقِ خدا سے محبت چوتھا بنیادی وصف جو دعوت کا فرض انجام دینے کے لیے شرطِ لازم کی حیثیت رکھتا ہے خلقِ خدا سے گہری محبت اور ان کی سچی بہی خواہی ہے۔ محبت ان کی دنیا کی بھی، ان کی آخرت کی بھی۔ بہی خواہی ان کی یہاں کی فلاح و بہبود کے بارے میں بھی اور ان کی اُخروی نجات و کامرانی کے سلسلے میں بھی۔ داعی حق کو لازماً محبِ خلق بھی ہونا چاہیے۔ لوگوں کی دنیوی تکلیفوں، محرومیوں اور پریشانیوں کی ٹیس بھی اسے اپنے اندر محسوس کرنی چاہیے اور ان کی آخرت کو ناکام بنا دینے والی گمراہیوں اور بداعمالیوں پر بھی بے چین رہنا چاہیے۔ صرف اس لیے نہیں کہ اس کے بغیر وہ ان کے دلوں میں اپنے لیے جگہ نہیں بنا سکتا۔ بلکہ فی الاصل اس لیے کہ یہ انسانیت کا بنیادی جوہر اور ایمان و اسلام کا فطری خاصہ ہے۔ اسلام کا کہنا یہ ہے کہ پوری نوعِ انسانی ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہے اور سارے انسان اللہ کا کنبہ ہیں۔ اس نقطۂ نگاہ سے وہ شخص فی الواقع بلا انسانیت کا انسان ہے جو دوسرے انسانوں کو اُنس و یگانگت کی نگاہ سے نہ دیکھے۔ وہ شخص اسلام و ایمان کی حقیقت یعنی خدا کی محبت سے ناآشنا ہے جس کے اندر اس کے کنبہ کی محبت نہ ہو۔ غرض حقیقی انسانیت اور حقیقی خدا پرستی دونوں ہی کا تقاضا ہے کہ مومن کے دل میں بندگانِ خدا سے محبت اور خیر خواہی کے جذبات موجزن ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قلبی کیفیت اپنے مخاطبین کے بارے میں جو تھی اسے قرآن حکیم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:-

"اس پر تمہارا تکلیفوں میں مبتلا ہونا بہت شاق گزرتا ہے اور وہ تمہاری بھلائی کا حریص ہے"۔
(سورۃ توبہ)

اس ارشادِ الٰہی میں "تم" سے مراد وہ لوگ ہیں جو نہ صرف یہ کہ ابھی ایمان نہیں لائے تھے بلکہ اس دعوت ایمان و اسلام کی برابر مخالفت کرتے آ رہے تھے۔ ایسے لوگوں کے حق میں بھی آپ کے قلب اطہر کے اندر غصہ اور نفرت تو درکنار کوئی بے پروائی اور بے رخی تک نہ تھی۔ اگر تھا تو بھائی چارگی کا احساس تھا، مروت کا جذبہ تھا، محبت تھی، دلسوزی تھی، ان کی بدنصیبیوں پر کڑھن تھی۔ آپؐ سے یہ دیکھا نہ جاتا تھا کہ لوگ اُن راستوں پر چلے جا رہے ہیں جو انہیں ہر طرح کی ناکامیوں کے کھڈ میں گرا دینے والا ہے اور اس بات کے صدقِ دل سے کوشاں اور آرزومند رہا کرتے تھے کہ لوگ اس راہ پر آجائیں جو انہیں دنیا و آخرت دونوں کی سعادتوں سے ہمکنار کرنے والی ہے۔ اس سلسلے میں آپ کے اندر جو جان گھُلا دینے والی بے قراری تھی اس کا حال قرآن مجید نے یہ بتایا ہے:۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنے آپ کو اُن کے پیچھے غم کے مارے ہلاک کر دیں گے اگر یہ لوگ اس قرآن پر ایمان نہ لائے"۔ (کہف)

اگر کسی شخص کے سامنے اللہ کے پیغمبر کا یہ اسوہ نہیں ہے اور وہ خلقِ خدا کی مصیبتوں پر پریشان ہونا نہیں جانتا اور اس کے لیے خیر و فلاح کا حریص نہیں ہے تو وہ دعوتِ حق کا کام صحیح معنوں میں ہرگز انجام نہیں دے سکتا۔

قول اور عمل کی یکسانی

پانچواں بنیادی وصف جسے دعوت کے کارکنوں میں لازماً موجود ہونا چاہیے، قول و عمل کی یکسانی ہے۔ ضروری ہے کہ جو اُن کی دعوت ہو وہی ان کی زندگی بھی ہو۔ وہ زبان سے جس حق کی طرف لوگوں کو بلا رہے ہوں، اس کی صداقت اور حقانیت پر اپنے کردار کی شہادت بھی پیش کر رہے ہوں۔ اُن پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو کہ جس دعوت کو وہ لے کر اٹھے ہیں اس کے اوّلین مخاطب وہ خود ہیں۔ دین کی جس اقامت کو وہ اپنا واحد فریضہ حیات قرار دیتے ہیں اس کی کامیاب ابتداء اگر ہو سکتی ہے تو ان کی اپنی ذات سے ہو سکتی ہے۔ اللہ کا دین پہلے اس کی دعوت دینے والوں کے دلوں پر، اُن کے اخلاق و کردار پر، اور ان کے جذبات و میلانات پر قائم ہوتا ہے۔ تب کہیں جا کر باہر کی دنیا کی تسخیر کا امکان پیدا ہوتا ہے۔ دعوت بلا عمل نہ صرف یہ کہ دوسروں کو متاثر نہیں کر سکتی بلکہ خود اپنے خلاف دلیل بن جاتی ہے۔

داعی اپنی بے کرداری، سیرت کی خامی اور قول و عمل کے تضاد کو لوگوں کے سامنے دیوار بنا کر کھڑی کر دیتا ہے کیونکہ دنیا بالعموم کسی دعوت کو اس کے علمبرداروں کی زبان سے نہیں بلکہ ان کے عمل سے سمجھا کرتی ہے۔ بڑے بڑے دعووں، مسحور کن تقریروں اور حسین و بلیغ تحریروں کے سامنے نہیں بلکہ ذوقِ یقین، حسنِ خلق اور پاکیزگیٔ عمل ہی کے سامنے جھکا کرتی ہے۔ پس دعوت کا اپنے کارکنوں پر سب سے بڑا حق یہ ہے کہ ان کا عملی رویہ بھی لازماً اس کی صداقت کی گواہی دیتا رہے۔ لوگ چاہے اس کی بات نہ مانیں مگر نہ ماننے کا سبب وہ خود ہرگز نہ بنیں۔ اس بارے میں ان کے سامنے معیارِ مطلوب یہ ہو کہ مخالف سے مخالف بھی داعی کی حسنِ نیت اور حسنِ سیرت کا انکار نہ کر سکے۔ اور دعوت کو رد بھی کرے تو اس اعتراف کے ساتھ رد کرے کہ ہم تمہاری دعوت کو رد کرتے ہیں، تمہیں نہیں رد کرتے۔

طریقۂ کار کی پاکیزگی

چھٹی صفت طریقۂ کار کی پاکیزگی ہے۔ دعوتِ اسلامی کے کارکنوں کو برابر ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ دین کی اقامت کا کام جس طرح دنیا کا سب سے بڑا کام ہے اسی طرح سب سے پاکیزہ کام بھی ہے۔ دین کی اقامت کے معنی دنیا کو بھلائیوں سے آراستہ کر دینے کے ہیں۔ بھلائی کا کام جس طرح بُرے لوگوں کے ہاتھوں ممکن نہیں ہے اسی طرح بُرے طور طریقوں سے بھی ممکن نہیں ہے۔ خیر کو جب بھی فروغ حاصل ہوگا اور شر سے دنیا جب بھی پاک ہوگی پاکیزہ طریقوں سے ہی ہوگی۔ گندگی کو گندگی سے پاک نہیں کیا جا سکتا۔ دین کی اقامت کے پاکیزہ مقصد کے لیے ناپسندیدہ طریقے اگر اختیار کیے گئے تو وہ اُلٹے خود اس کے تقدس کو مجروح کر کے رکھ دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے اس نکتہ پر بار بار زور دیا ہے کہ بُرائی بہر حال بُرائی ہے وہ کسی حسنِ نیت یا کسی دینی مصلحت کے نام پر بھلائی نہیں بن سکتی۔ ولا تستوی الحسنة ولا السیئة ۔ اور ہدایت دی ہے کہ بُرائی کا ازالہ بھلے سے بھلے طریقے سے کرو۔ ادفع بالتی ھی احسن ۔ پس کسی بھی داعی اسلام کو غلط طریقوں کی بابت سوچنا بھی نہیں چاہیے چاہے بظاہر اس کا کتنا ہی فائدہ نظر آتا ہو کیونکہ یہ فائدہ دعوت کے حق میں دراصل باعتبارِ انجام بہت بڑا نقصان ہوگا۔

سچی خدا پرستی

آخر میں اس صفت کو لیجیے جو ساری صفات میں اوّلین مقام رکھتی ہے۔ یہ صفت اللہ تعالیٰ کی سچی اطاعت گذاری اور رضا طلبی کی صفت ہے۔ دعوت کا کام سرتاسر اللہ کا کام ہے۔ وہی اس کا مبدا بھی ہے اور وہی اس کا مرجع بھی۔ جو کام اللہ کے لیے ہو اس کی انجام دہی اسی وقت ممکن ہے جب

آدمی خود اللہ کا ہو جائے اور اس کی ساری آرزوئیں اسی کی رضا کی آرزو میں گم ہو گئی ہوں ۔ یہ ایک صاف اور سیدھی سی حقیقت ہے جس سے کوئی بھی ایسا شخص ناواقف نہیں ہو سکتا جو اسلام سے واقف ہو۔ پس کوئی شبہ نہیں کہ دعوت کا کام انجام دینے کے لیے جو چیز بنیادی حیثیت رکھتی ہے وہ یہی سچی خدا پرستی اور خدا کی سچی رضا طلبی ہے۔ یہی وہ خاص وصف ہے جو کسی تحریک کو اسلامی تحریک اور اس کے کارکن کو اسلامی تحریک کا کارکن بناتا ہے۔ یہی وہ خاص وصف ہے جو اسلامی اور غیر اسلامی تحریکات میں جوہری امتیاز پیدا کرتا ہے۔ یہی وہ خاص وصف ہے جو انسان کو بدی اور غفلت کی ظلمتوں سے نکال کر نورِ حق کی طرف لے جاتا اور اس کی نگاہوں کو بھٹکنے سے بچاتا ہے۔ یہی وہ خاص وصف ہے جو دعوت کے کارکنوں کو اپنے مشن کا سچا وفادار بنائے رکھتا ہے اور یہی وہ خاص وصف ہے جو دعوت اور اہل دعوت کو اللہ کی نصرتوں کا سزاوار بناتا ہے۔ اس وصف سے محروم ہو جانے کے بعد آدمی دعوتِ حق کے کسی کام کا نہیں رہ جاتا خواہ وہ بظاہر عظمت اور مقبولیت کی چوٹیوں ہی پر بیٹھا نظر آتا ہو۔ غرض یہ ایسی صفت ہے جو دعوت اسلامی کی روح کی حیثیت رکھتی ہے جسے دراصل اُمّ الصفات کہنا چاہیے۔ سچی خدا پرستی اور للّٰہیت کی صفت کا پیدا ہو جانا فی الواقع ایک طرف تو ساری ایمانی اور دعوتی صفات کی شاہ کلید کا ہاتھ آ جانا ہے۔ دوسری طرف اُن اخلاقی نجاستوں سے اپنے آپ کو پاک رکھنے کا نسخۂ کیمیا بھی پالینا ہے جو آدمی کو دعوت ہی نہیں انسانیت کے مقام سے بھی گرا دیتی ہیں۔ جس شخص کے اندر بندگی کا اخلاص، آخرت کی بازپرس کا خوف اور اللہ کی خوشنودی کی طلب رچی بسی ہو گی وہ دعوت کا علمبردار ہوتے ہوئے فخر و غرور، نمود و نمائش، تعلّی اور خود ستائی، ریا، خود پرستی اور خود رائی کی اُن بیماریوں سے، نہ خود گھن کھائے گا جو تحریکوں، لیڈروں اور کارکنوں میں عام طور سے پیدا ہو جایا کرتی ہیں اپنے فرض کا احساس اور اپنے انجام کی فکر اسے اپنے نفس کا ایسا محتسب بنائے رکھے گی جو اسے اس طرح کی کسی اخلاقی بیماری کے قریب نہ جانے دے گا۔ خود احتسابی کے بغیر کوئی بھی شخص ایمان کے مطالبات اور دعوت کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا اور یہ خود احتسابی انسان کو میسر نہیں آ سکتی اگر اس کا رشتہ اپنے معبود سے مضبوط نہ ہو۔ اس لیے دعوت کے کارکنوں کو ایک لمحہ کے لیے اپنے عبدیت کے سچے احساس اور اپنے آقا و مولیٰ کی رضا جوئی سے غافل نہ رہنا چاہیے۔

یہ ہیں وہ اعلیٰ بنیادی صفات جو کسی بندۂ خدا کے اندر جمع ہو جاتی ہیں تو وہ صحیح معنوں میں حق کا داعی اور تحریک اقامت دین کا رکن بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے تمام بندوں کو اپنے دین کی سچی خدمت کا جذبہ اور اس کی نصرت و اقامت کی صحیح توفیق عطا فرمائے۔ ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا وھب لنا من لدنک رحمۃ انک انت الوھاب ۔

اسلامی تربیت اور معاشرے پر اس کے اثرات

از جناب آباد شاہ پوری صاحب

"گذشتہ سال ریاض (سعودی عرب) میں فقہ اسلامی کی جو کانفرنس ہوئی تھی اس میں "اردو ڈائجسٹ" لاہور کے نمائندے کی حیثیت سے راقم الحروف کو بھی دعوت نامہ ملا تھا، لیکن حکومت کی طرف سے اجازت نہ مل سکنے کے باعث نہ جا سکا۔ یہ مقالہ کانفرنس میں پڑھنے کے لیے لکھا تھا اور اس کا عربی ترجمہ امام محمد بن سعود یونیورسٹی کے چانسلر کو بھجوا دیا تھا۔"

۱۔ معاشرہ افراد کے مجموعے کا نام ہے۔ فرد کی مثال اُس مرکزہ (NUCLEUS) کی ہے جس کے اِرد گرد خلیے جمع ہوتے ہیں اور پھر ایک وجود تشکیل پاتا ہے۔ یہ مرکزہ جس نوعیت کا ہوتا ہے، اُس کو وجود میں لانے کے پیچھے جو نظریہ اور ارادہ کارفرما ہوتا ہے، معاشرہ بھی اسی نوعیت کا وجود میں آتا ہے۔ ایک پودے کے مرکزے سے پودا ہی پیدا ہوتا اور برگ و بار لاتا ہے۔ کسی جانور کے مرکزے سے جانور ہی جنم لیتا ہے اور انسان کے مرکزے سے انسان ہی صورت پذیر ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی معاشرے کے مرکزوں (افراد) سے اُسی نوعیت کا معاشرہ وجود میں آئے گا جس نوعیت کے وہ مرکزے ہوں گے۔ پھر جس طرح پودے اور درخت کی پیدائش اور نشوونما کا انحصار مخصوص بیج، مخصوص طریقِ کاشت، زمین کی ماہیت اور آب وہوا کی کیفیت پر ہوتا ہے اور کسی جانور اور انسان کو وجود میں آنے کے لیے مخصوص مرکزوں اور خلیوں، مخصوص تخلیقی عمل، خصوصی ماحول، خاص قسم کی غذا اور خصوصی عوامل درکار ہوتے ہیں، اسی طرح فرد جس ماحول میں پرورش پاتا ہے، اس کی فکری صلاحیتیں، کائنات، خالقِ کائنات اور کائنات میں انسان کا مقام متعین کرنے والے جس فلسفے اور نظریے کے تحت نشوونما پاتی ہیں، اُس کی سیرت جس اخلاقی سانچے میں ڈھلتی ہے،

اور وہ زندگی کے جس مقصد کو اپنا کر اپنا منہاجِ عمل متعین کرتا ہے، اس سے تشکیل پانے والا معاشرہ اسی ماحول، اسی فلسفے اور نظریے، اسی سیرت و کردار، انہی اخلاقی اصولوں اور اسی منہاجِ عمل کا حامل ہوگا۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ افراد کے افکار و نظریات، مقصدِ زندگی اور اخلاقی اصول تو کچھ اور ہوں مگر اُن کے مجموعے سے جو معاشرہ صورت پذیر ہو اس کی خصوصیات بالکل برعکس ہوں۔

۲- افراد کے افکار و نظریات اور سیرت و کردار کے سانچے میں معاشرہ کس طرح ڈھل جاتا ہے اس کا عہد بعہد سرسری جائزہ بھی اس مختصر مقالے میں ممکن نہیں، اس لیے ہم جدید دَور کے حوالے سے بات کریں گے۔

ا- جدید عمرانیات میں انسان کو معاشرتی جانور (SOCIAL ANIMAL) قرار دیا گیا ہے۔ اس تصور کی بنیاد پر دو قسم کے معاشرے وجود میں آتے ہیں۔ ایک وہ جس میں انسان جانور ہی کی طرح آزاد ہے کہ وہ جو روش چاہے اختیار کرے، جس کھیت اور چراگاہ میں چاہے منہ مارے، اُسے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں۔ اس لیے کہ وہ بنیادی طور پر جانور ہے اور یہ اس کی جبلت کا تقاضا ہے۔ مگر چونکہ وہ عام جانوروں سے زیادہ مہذب، شائستہ اور صاحبِ عقل و دانش ہے اور اس کے لیے معاشرتی زندگی بسر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں، اس لیے کچھ حدود مقرر کر دی گئی ہیں کہ بس وہ کسی کھیت میں منہ مارتے وقت، اپنے نفس کی کوئی احتیاج پوری کرتے وقت، اپنی کسی خواہش کو عملی جامہ پہناتے وقت اس بات کا خیال رکھے کہ یہ سارے کام دوسرے معاشرتی جانوروں کی رضامندی سے ہوں۔ یہ رضامندی اسے حاصل ہو جائے تو پھر کوئی بدی، بدی نہیں، کوئی لاقانونیت، لاقانونیت نہیں، کسی کی حق تلفی، حق تلفی نہیں، کسی کی بے آبروئی، بے آبروئی نہیں اور کسی کی عصمت و ناموس، عصمت و ناموس نہیں۔ وہ فریقِ ثانی کی رضا کے ساتھ ہر غیر اخلاقی، ہر ظلم اور ہر جرم کر سکتا ہے۔ دوسرے معاشرتی جانوروں کو لوٹ کھسوٹ کر اپنا گھر بھر سکتا ہے اور دوسروں کو تباہ کر کے عیش و نشاط کے ٹھاٹھ جما سکتا ہے، کسی کی ناموس کو اپنے گھر میں ڈال سکتا ہے یا گھر میں ڈالے بغیر اس سے کھیل سکتا اور نفس کی آگ بجھا سکتا ہے۔ البتہ اگر وہ جبراً کرتا ہے تو یہ جرم ہے اور بُری بات۔ اب مہذب جانوروں کا معاشرہ مجبور ہے کہ وہ ایسے کسی غیر مہذب، ناشائستہ فعل کا احتساب کرے اور اپنے قانون کو حرکت میں لے آئے۔

یہ نقطۂ نظر اس ریاست کی قانون سازی میں بھی پوری طرح کارفرما ہوتا ہے جو یہ "معاشرتی جانور"

قائم کرتے ہیں ۔ اس طرح یہ حیوانی آزادی محض افراد تک محدود نہیں رہتی بلکہ اجتماعی صورت اختیار کر لیتی ہے اور ریاست کے ہر ادارے میں ان کی یہ حیوانیت رقصاں دیکھی جاسکتی ہے اور جب اس جانور کا سابقہ اپنے معاشرے سے باہر دوسرے معاشروں سے پڑتا ہے تو اس کی مہذّب حیوانیت، اس کے شائستہ فلسفے، ترقی پسندانہ قوانین اور روشن خیالی پر مبنی ضابطے، سب طاق میں دھرے رہ جاتے ہیں۔ اب وہ درندہ بن کر نمودار ہوتا ہے جو اپنے سے کمزور جانوروں کو چیرتا پھاڑتا ہے، ان کے حقوق غصب کرتا ہے، ان کی زمینوں پر قبضہ جماتا اور انہیں اپنا غلام بناتا ہے اور اس باب میں وہ کسی بھی حد اور رکاوٹ کا قائل نہیں رہتا۔

دوسرا معاشرہ وہ ہے جس میں "معاشرتی جانوروں" کا ایک چھوٹا سا چالاک و ہنرمند گروہ، اپنے عام ہم جنسوں یا اُن کے ایک خاص طبقے کے نام پر معاشرے کی باگ ڈور سنبھال لیتا ہے اور پھر اُس کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کرتا ہے۔ انہیں اسی طرح اپنی لاٹھی سے ہانکتا ہے جس طرح کوئی ظالم چرواہا بے زبان اور بے بس و مجبور مویشیوں کو ہانکتا ہے۔ انہیں ناپ تُلا چارہ اور راتب دیتا ہے۔ دن کے دس دس بارہ بارہ گھنٹے ان سے کام لیتا ہے اور پھر انہیں "باڑوں" میں واپس بھیج دیتا ہے کہ چند گھنٹے آرام کرکے اگلے روز کا مقررہ کام (NORMS) کرنے کے لیے تازہ دم ہو جائیں۔ اس ظالمانہ سلوک میں وہ مرد و عورت میں کوئی امتیاز نہیں کرتا۔ اس معاشرے میں "معاشرتی جانور" کی حیوانیت کے کامل مظاہرے دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہاں چرواہے پوری کوشش کرتے ہیں کہ معاشرتی جانوروں میں آزادانہ سوچنے سمجھنے اور بولنے کی جو صلاحیتیں پائی جاتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے انہیں انتخاب اور ارادے کی جو آزادی بخشی ہے ان سے وہ کام نہ لے پائیں بلکہ سوچ کا جو سانچا وہ (چرواہے) تیار کریں اس میں یہ صلاحیتیں ڈھل جائیں اور اُن کی خودی موت کے گھاٹ اُتر جائے اور وہ عام جانوروں کی طرح انتخاب اور ارادے کی قوت اور آزادی سے محروم ہو جائیں۔

ب ۔ اس نظریے کی بنیاد پر جو معاشرہ وجود میں آتا ہے اس کا فلسفہ یہ ہے کہ یہ دو ٹنگا جانور اپنے کسی پیدا کرنے والے کے آگے جوابدہ نہیں ۔ نہ کوئی خدا ہے نہ رسول نہ کتاب، نہ حشر و نشر۔ ان کی زندگی بس اسی دُنیا تک محدود ہے اور ان کا کام بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ ذرا عام جانوروں کی نسبت مہذب طریقے سے رہیں سہیں، چریں چگیں، نسل بڑھائیں اور مر جائیں۔

۴۔ اسلام کا انسان کے بارے میں تصور اس سے بالکل مختلف ہے۔ اس کے نزدیک وہ خدا کی افضل ترین (MOST EXALTED) مخلوق ہے، وَهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (الاعراف: ۱۳۹)، جس کو اس نے بہترین ساخت کے ساتھ پیدا کیا ہے، لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (التین: ۴)، اُسے زبردست فکری وعملی قوتیں اور صلاحیتیں عطا کی ہیں، هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ (الملک: ۲۳)، اور زمین پر اپنا نائب (VICE GERENT) بنایا ہے، هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰۗىِٕفَ فِي الْاَرْضِ (فاطر: ۳۹)۔ پھر اس افضل ترین، بہترین ساخت اور اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والی مخلوق کو بے مقصد نہیں پیدا کیا کہ کھائے پیئے، چند روزہ زندگی کے مزے لوٹے اور مر جائے۔ نہیں وہ آزمائش کے لیے پیدا کی گئی ہے اور اس مقصد کے لیے اُسے حق و باطل، نیکی اور بدی کی راہ کو منتخب کرنے اور اس پر چلنے کی پوری آزادی بخشی گئی ہے۔ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۝ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝ (الدھر: ۲، ۳)۔

بے شک اس افضل ترین مخلوق —— انسان —— میں ایک حیوان بھی ہے جس کے بغیر انسان کی انسانیت کی تکمیل ہی نہیں ہو سکتی۔ تاہم انسانی قالب کی پوری مشینری میں اُسے بالکل ناگزیر حیثیت دی گئی، اور اُسے قابو میں رکھنے کے لیے انسان کو بدی اور نیکی کا احساس اور ان میں امتیاز کرنے کے لیے ضمیر کی قوت اور علم (وحی الٰہی) کی روشنی بخشی گئی۔ اس حیوان کے حدود عمل بھی متعین کر دیے کہ ان کے دائرے میں رہ کر اپنا تخلیقی فریضہ سر انجام دے۔ اس حیوان کا انسان پر بس اتنا حق ہے کہ وہ اسے زندہ رہنے کا اس قدر سامان فراہم کرتا رہے کہ اُس کی یہ زندگی انسان کو اپنے فرائض بندگی ادا کرنے کے قابل بنائے اور اتنا نہ پلے پوسے کہ وہ اسے اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں بغاوت اور سرکشی پر آمادہ کر دے۔ گویا اسلام انسان کے اندر کے حیوان کو نہیں انسان کو اہمیت دیتا ہے اور اس انسان کی دنیا میں بقا و ترقی اور آخرت میں نیک انجام کو اس کا اصل مقصدِ زندگی قرار دیتا ہے۔

یہ سارا اہتمام انفرادی طور پر کیا گیا ہے۔ یعنی پورے معاشرے یا کسی خاص طبقے کو اجتماعی طور پر نہیں بلکہ ہر شخص کو فرداً فرداً ان تمام قوتوں اور صلاحیتوں سے نوازا گیا ہے۔ اس لیے ہر انسان کو اس کے طرزِ عمل کا ذمہ دار بھی فرداً فرداً گردانا گیا ہے اور آخرت میں بھی ہر شخص اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اسی طرح فرداً فرداً

حاضر ہوگا جس طرح فرداً فرداً وہ دنیا میں آیا تھا، وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادَىٰ كَمَا خَلَقْنَٰكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ (الانعام: ۹۴) اور پھر اس سے دنیوی زندگی کے شب و روز کے ایک ایک لمحے کا حساب لیا جائے گا اور اسے پوری پوری جزا اور سزا دی جائے گی۔ وَأَنَّ سَعْيَهُۥ سَوْفَ يُرَىٰ ثُمَّ يُجْزَىٰهُ الْجَزَآءَ الْأَوْفَىٰ (النجم: ۴۱)۔ وہاں ہر فرد کو اپنا بوجھ خود اٹھانا ہوگا اور دنیا کی زندگی میں اس نے جیسی کچھ جدوجہد آخرت کی زندگی کے لیے کی تھی ویسا ہی پھل اسے مل جائے گا۔ أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَٰنِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (النجم ۳۸-۳۹)، اور اس کا یہ عذر قابل سماعت نہ ہوگا کہ وہ معاشرے کے مقابلے میں بے بس تھا اور اسے دنیوی رہنماؤں اور مذہبی پیشواؤں نے غلط اور سرکشی کے راستے پر چلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وَقَالُوا رَبَّنَآ إِنَّآ أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا (الاحزاب: ۶۷) وہ درخواست کرے گا کہ ان لیڈروں اور پیشواؤں کو دہرا عذاب دیا جائے رَبَّنَآ ءَاتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيرًا (الاحزاب: ۶۸) ان کی اس التماس پر کہا جائے گا کہ لیڈروں اور پیشواؤں اور ان کے اندھے پیروؤں سب کو دوہرا عذاب ملے گا لِكُلٍّ ضِعْفٌ (الاعراف: ۳۸)۔

اس طرح اسلام انسان کا مقام و مرتبہ متعین کرنے کے ساتھ ساتھ فرد اور معاشرے کا مقام اور حیثیت بھی متعین کر دیتا ہے۔ یعنی فرد معاشرے کی تخلیق نہیں بلکہ بہت سے افراد مل کر معاشرہ تخلیق کرتے ہیں۔ یہ افراد جن افکار و نظریات اور عقائد و اخلاق کے سانچے میں ڈھلے ہوں گے، معاشرہ بھی انہی افکار و نظریات اور عقائد و اخلاق پر مبنی ہوگا۔ اور چونکہ قیامت کے روز ہر فرد انفرادی طور پر اپنے اعمال و افعال کا جواب دہ ہے، اس لیے معاشرے کو یہ حق نہیں ہے کہ افراد کو ان کے افکار و نظریات اور عقائد و اخلاق کے مطابق زندگی بسر نہ کرنے دے اور انہیں اپنی مرضی کی لاٹھی سے جانوروں کی طرح ہانکتا پھرے، اس لیے کہ انسان جانور نہیں اشرف المخلوقات ہے۔

۵- اسلام کے نقطۂ نظر سے انسان کے اس مقام اور اس کی انفرادی حیثیت کو مدنظر رکھیے اور اب دیکھیے کہ اسلام کس قسم کا معاشرہ وجود میں لانا چاہتا ہے۔

اسلامی معاشرہ دنیا کے تمام معاشروں سے بالکل جدا رنگ رکھتا ہے۔ یہ نہ نسل و نسب پر مبنی ہے اور نہ زبان اور وطن پر۔ بلکہ یہ تہذیبی اور نظریاتی بنیادوں پر تشکیل پاتا ہے۔ اس کی تشکیل بھی وہی

لوگ کر سکتے ہیں اور اسے راست بنیادوں پر قائم بھی وہی رکھ سکتے ہیں جو ان بنیادوں کو نہ صرف تسلیم کرتے ہیں بلکہ اپنی انفرادی زندگی کو ان پر ٹھیک ٹھیک استوار بھی کرتے ہیں۔ خواہ وہ کسی سرزمین سے تعلق رکھتے ہوں اور رنسل و نسب، رنگ اور زبان اور وطنی قومیت وغیرہ کی کوئی قدر مشترک ان کے درمیان نہ ہو۔

اسلامی معاشرے کا کلمۂ جامعہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ہے۔ یہ وہ پاک کلمہ ہے جس پر ایمان لانے کے بعد ایک شخص اسلامی معاشرے کو تشکیل دینے والی ایک اکائی بن جاتا ہے۔ یہی مختصر سا بول اسلامی معاشرے کو وہ تہذیبی اور نظریاتی بنیادیں فراہم کرتا ہے جس پر اس کی عظیم اور دلکش عمارت کھڑی کی گئی ہے۔ اس کلمہ کو ادا کرنے کے بعد ایک شخص یہ تسلیم کر لیتا ہے کہ اس کا اور اس کے گرد و پیش پھیلی ہوئی ساری کائنات کا خالق، مالک، آقا اور حکمراں اللہ تعالیٰ ہے، جس نے اپنے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ نوعِ انسان کو وہ نظامِ فکر و عمل بخشا ہے جو زندگی کے ایک ایک شعبے پر حاوی ہے اور جسے اپنائے بغیر انسان نہ دنیا کی زندگی چین اور اطمینان سے بسر کر سکتا ہے اور نہ آخرت میں نجات پا سکتا ہے۔

یہ نظامِ فکر و عمل افراط و تفریط سے پاک ہے۔ انسان کے لیے دو انتہاؤں سے ہٹ کر متوسط راستہ متعین کرتا ہے۔ اس لیے اسلامی معاشرہ ایک متوازن معاشرہ ہے۔ عبادت ہو یا سیاست و معاشرت، معیشت ہو یا کوئی اور شعبۂ زندگی، اس کے احکام اور تعلیمات ہر معاملے میں اعتدال پسندانہ ہیں۔ پھر یہ ایک غیر طبقاتی اور غیر نسلی معاشرہ ہے جس میں کالے گورے، عربی عجمی، امیر و غریب، آقا و غلام کے درمیان کوئی امتیاز نہیں، نہ یہاں پیدائش یا پیشے کے اعتبار سے کوئی شخص شریف اور رذیل ہے۔ سب مسلمان برابر اور بھائی بھائی ہیں۔

اسلامی معاشرہ بے مقصد معاشرہ نہیں۔ یہ انسان کو دنیا میں نیکی، راست روی اور حق پرستی کی زندگی بسر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اُمتِ مسلمہ کا مقصدِ وجود یہ ہے کہ عالمِ انسانیت کے سامنے اپنے عمل سے گواہی دے کہ اسلام زندگی کا جو نظام دیتا ہے وہی دنیا اور آخرت میں فلاح و کامرانی کا بہترین نظام ہے۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (البقرہ: ۱۴۳)۔ اس لحاظ سے یہ ایک مثالی معاشرہ ہے، اور ساری دنیا کے لیے بہترین نمونۂ اتباع۔

۶ - ایسا مثالی معاشرہ، مثالی اور کامل السیاد افراد ہی وجود میں لا سکتے ہیں۔ اسی لیے اسلام افراد کی فکری و عملی تربیت کو بنیادی اہمیت دیتا ہے۔ وہ انہیں قانون کی لاٹھی سے ہانکنے یا اجتماعی قوت کے ذریعے ایک ضابطہ میں کس دینے کے بجائے ان کے فکر و نظر میں انقلاب برپا کرتا ہے، ان کے سوچنے سمجھنے کے زاویے بدلتا ہے، زندگی اور کائنات اور خدا کے بارے میں ان کے غلط تصور کو بدل ڈالتا ہے، ان کی پسند اور ناپسند کا معیار بدلتا ہے، ان کی دلچسپیوں کے مرکز اور دائرے تبدیل کرتا ہے۔ غرض وہ تمام تبدیلیاں جو دوسری نظریاتی و تہذیبی قوتیں جبر و تشدد کے ہتھیاروں سے لاتی ہیں وہ اسلام، افراد کے دل و نگاہ کی تبدیلی سے لے آتا ہے۔ اس تبدیلی کے بعد وہ ان کی سیرت و کردار کو تربیت کے مخصوص سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔ وہ قانون نافذ کرتا بھی ہے تو ایسی فضا اور ماحول پیدا کرنے کے لیے جس میں افراد کو اس تربیت میں مزید مدد مل سکے اور اس کے منافی اور ناسازگار ماحول جنم نہ لے سکے۔

اسلام کی اس تربیت کے چند بنیادی اور اہم رُخ حسب ذیل ہیں:-

ا - یہ تربیت ایک مسلمان میں اسلامی نظریۂ حیات کی برتری اور اس کے برحق ہونے کا پختہ و کامل یقین پیدا کرتی ہے تاکہ وہ دنیا کے دوسرے نظریات سے مرعوب نہ ہونے پائے خواہ وہ نظریات زمانے میں کتنے ہی مروّج اور غالب و طاقتور کیوں نہ ہوں۔ اُن کے باطل ہونے پر اس کا پختہ ایمان ہو، ان کے پھیلائے ہوئے فکری و نظریاتی اور مادی جال کو وہ تارِ عنکبوت سمجھے جو حقیقت و صداقت اور ایمان کی قوت کے آگے نہیں ٹھہر سکتا۔ حالات چاہے کیسے ہی رُوح فرسا اور مایوس کن ہوں اور دنیا کا دھارا چاہے کتنے ہی مخالف رُخ پر جا رہا ہو اور بادِ مخالف کتنی ہی تند و تیز ہو، اُس کا دل یقین کے اس نور سے منور رہے کہ حق وہی ہے جس پر وہ ایمان لایا ہے۔

ب - یہ تربیت اسلامی نظریے پر ایمانِ کامل اور پختہ یقین پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ مسلمان کی زندگی کو عملی رنگ میں اس طرح رنگتی ہے کہ یہ زندگی پکار پکار کر شہادت دیتی ہے کہ اُس کا واقعی اس نظریۂ حیات کے برحق ہونے پر ایمان ہے۔ قول و عمل کی ہم آہنگی ہی وہ قوت ہے جو حق کی تلاش میں سرگرداں اور حق کی خواہاں دنیا کو متاثر کرتی ہے۔ قول و عمل کا تضاد منافقت کی علامت ہوتا ہے اور نفاق وہ روگ ہے جو کسی معاشرے کو تباہ کر کے رکھ دیتا ہے۔ اسی لیے اسلام کا تربیتی پروگرام قول و عمل میں مطابقت پر بہت زیادہ زور دیتا ہے۔

ج۔ مقصد سے محبت، عزمِ راسخ اور مضبوط کردار پیدا کرتی ہے تاکہ وہ حق کے سوا ہر چیز کو ٹھکرا دے، اپنے موقف پر پہاڑ کی طرح جما رہے، اصولوں پر نہ مصالحت کرے اور نہ مداہنت پر آمادہ ہو، نہ لوگوں کی خواہشات کا اتباع کرے، حق میں کسی کو ساجھی نہ بنائے، مزاحم قوتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرے اور باطل کے دباؤ میں نہ آئے۔

د۔ یہ تربیت خدا پرستی اور اللہ کے ساتھ گہرا لگاؤ پیدا کرتی ہے۔ دل و دماغ میں یہ بات راسخ کر دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طاقت سب طاقتوں سے بالا اور زبردست ہے۔ مسلمان کو چاہیے کہ اس کے سوا کسی سے خوف نہ کھائے اور ہر غیر اللہ سے کٹ کر اس کا ہو جائے۔ اسی پر توکل اور بھروسا کرے۔ اس کی راہ میں آنے والی مشکلات و مصائب کا مقابلہ صبر و استقامت سے کرے۔ اس کے شب و روز خداخوفی، تقوٰی، امانت و دیانت، عدل و احسان، صدقِ مقال، وفائے عہد، راستبازی، پاکیزگیٔ سیرت، طہارتِ کردار اور اخلاقِ فاضلہ کے سانچے میں ڈھالتی ہے۔ معاشرے کو بگاڑنے والے اسباب و عوامل کے خلاف اس کے دل میں نفرت کے نہ مرنے والے بیج بو دیتی ہے۔ توحید، رسالت اور آخرت کے بنیادی عقائد سے دنیا اور آخرت میں جو اخلاقی نتائج رونما ہوتے ہیں اُن کا احساس قلب و ذہن میں اتنا گہرا بٹھاتی ہے کہ جب بھی انسان کوئی کام کرنے کا ارادہ کرتا ہے اس کے نتائج و عواقب اس کی لوحِ ذہن پہ اُبھر آتے ہیں اور اگر وہ نتائج بُرے ہوں تو اس کا یہ احساس فوراً اس کے قدم روک دیتا ہے۔

س۔ جماعتی شعور اور نظم و ضبط پیدا کرتی ہے۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور بے چون و چرا اطاعت کا سبق سکھاتی ہے۔

ش۔ حق گو، بے باک اور بے خوف بناتی ہے تاکہ مسلمان، معاشرے کو سیدھے راستے پہ گامزن رکھنے میں ساعی ہوں اور غلط راہوں پہ جانے سے روکیں۔ مسلمانوں کی سب سے بڑی ذمہ داری یہی ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے علمبردار بن کے رہیں۔ انہیں اُٹھایا ہی اس لیے گیا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

(آل عمران: ۱۱۰)۔ اس فرض کو انجام نہ دینے سے ایمان تک مشتبہ ہو جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص کسی منکر کو دیکھے اسے چاہیے کہ وہ اس کو ہاتھ (یعنی طاقت) سے روک دے، لیکن اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو اس کے خلاف آواز بلند کرے، اور اگر اس کی ہمت بھی نہ ہو تو پھر کم از کم

اپنے دل میں اسے بُرا جانے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔ من رأی منکم منکرًا فلیغیّرہ بیدہٖ فان لّم یستطع فبلسانہٖ فان لم یستطع فبقلبہ وذٰلک اضعف الایمان (مسلم) ایک اور حدیث میں ہے کہ اس سے ورے رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہے ولیس وراء ذٰلک من الایمان حبۃ خردل یعنی منکر کو اگر کوئی مسلمان دل میں بھی بُرا نہیں سمجھتا، اس سے سازگاری پیدا کر لیتا ہے یا غیر جانبدارانہ رویّہ اختیار کرتا ہے، تو اسے اپنے ایمان کی خیر منانی چاہیے۔

ﷺ۔ تربیت اسلامی اس قدر اخلاص پیدا کرتی ہے کہ وہ نیکی کا جو کام بھی کرتا ہے محض اللہ کی خاطر اور خوشنودی کے لیے کرتا ہے۔

۷۔ یہ ہے وہ تربیت جو اسلام اپنے حلقہ بگوش افراد کی کرتا ہے، جن کے جماعتی زندگی بسر کرنے سے اسلامی معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکی زندگی کے بارہ برسوں میں جو افراد تیار کیے انہیں انہی خطوط پر تربیت دی اور ان کا تزکیۂ کردار کیا۔ پھر جب ان افراد نے مدینہ کی زندگی میں باقاعدہ ایک معاشرے کی صورت اختیار کر لی اور ایک اسلامی ریاست قائم ہو گئی اور یدخلون فی دین اللہ افواجا کا سماں بندھ گیا تو اس زمانے میں بھی خواہ دور امن ہوتا یا حالت جنگ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کی تربیت باقاعدہ کرتے رہتے تھے۔ مدینہ کی زندگی میں اسلامی تہذیب و تمدن، عبادات، معاشی زندگی اور سیاسی نظام کے احکام دیے اور قوانین نافذ کیے گئے۔ لیکن ان احکام و قوانین کو نافذ کرنے سے پہلے افراد کو ذہنی طور پر تیار کیا گیا تاکہ وہ انہیں اپنی دنیا اور آخرت کی زندگی سنوارنے کا موجب سمجھتے ہوئے پوری خوشدلی کے ساتھ قبول کریں۔ حضورؐ کی حیاتِ مبارکہ میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ کوئی قانون بجبر نافذ کیا گیا ہو بلکہ کیفیت یہ تھی کہ اہلِ ایمان اشارۂ ابرو کے منتظر رہتے تھے کہ حضورؐ کوئی حکم فرمائیں اور ہم اس کی پیروی کر کے دنیا اور آخرت کی سعادتیں سمیٹیں۔

اس تربیت سے جس قسم کے افراد تیار ہوئے ان کی نظیر دنیا کا کوئی معاشرہ اور غیر مسلم تاریخ کا کوئی دور پیش نہیں کر سکتا۔ تصور کیجیے جس معاشرے کے افراد صرف ایک اللہ کی غلامی اور ایک رسولؐ کی قیادت تسلیم کرتے ہوں، پاک دل و پاکباز ہوں، اخلاقِ فاضلہ سے جن کی زندگیاں مزین ہوں، جو ایک دوسرے کی جان و مال اور آبرو کا احترام ہی نہ کرتے ہوں بلکہ محافظ بھی ہوں، جھوٹی تہمتیں نہ باندھیں، ٹونے ٹوٹکوں، جادو اور توہمات کے اسیر نہ ہوں، علم کی روشنی سے جن کے قلب و ذہن تابندہ ہوں، جو امانت دار ہوں،

عہد و پیمان کے پابند ہوں، انصاف پسند ہوں، جن کا دامن شراب خوری، زنا، ڈاکہ زنی، چوری، جھوٹ، منافقت، حرص و طمع اور دوسرے اخلاقی ذمائم سے پاک ہو، جو فحش گوئی اور فحاشی سے دور بھاگتے ہوں، یتیموں اور کمزوروں کے حقوق غصب نہ کرتے ہوں، ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہوں، صدقہ و خیرات اور بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے سے مسابقت کرتے ہوں، عام نوعِ انسان کے غمخوار اور ہمدرد ہوں، آپس میں بھائی بھائی ہوں، اہلِ حق کے لیے نرم خو ہوں اور کافروں اور باطل پرستوں کے لیے سخت، فرض شناس اور ذمہ دار ہوں، صداقت شعار، وفاکیش، حق پرست، حق گو اور نڈر ہوں، ایک اللہ کے سوا کسی کے آگے نہ جھکتے ہوں نہ خوف کھاتے ہوں، ایسے افراد سے جو معاشرہ وجود میں آئے گا اس کی کیا کیفیت ہوگی؟

ایسا ہی معاشرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیار فرمایا تھا۔ اسلام سے پہلے عرب جاہل، اَن گھڑ، غیر مہذب اور ان پڑھ تھے۔ لیکن جب اس جاہلی معاشرے کی جگہ اسلامی تربیت یافتہ افراد پر مشتمل اسلامی معاشرے نے لی تو یہی لوگ ایسے عظیم عالم، جج، جرنیل، سیاستداں اور قانون داں بن کر اٹھے کہ جس طرف نکل گئے انہوں نے زمانے کا رُخ موڑ دیا۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا دھارا نئی شان و شوکت سے نئی راہ پر بہنے لگا۔ پہلے ہر طرف جہالت و وحشت کی تاریک رات طاری تھی۔ یہ حق کا پیغام لیے جہاں پہنچے صبح روشن نمودار ہوگئی۔

یہ اسی تربیت اسلامی کا اثر تھا کہ اسلامی معاشرہ صدیوں تک دنیا کے تمام معاشروں پر چھایا رہا۔ یورپ نے علم و تہذیب کی روشنی اسی سے لی اور اپنی تاریک راہوں کو منور کیا۔ جب تک افراد کی تربیتِ اسلامی کا اہتمام اسلامی معاشرے میں ہوتا رہا دنیا کی علمی و تہذیبی اور سیاسی قیادت اس کے ہاتھ میں رہی، لیکن جب یہ اہتمام پہلے کمزور پڑا اور پھر آہستہ آہستہ ختم ہوگیا تو دوسری نظریاتی اور تہذیبی قوتیں اس پر حملہ آور ہوگئیں۔ یہاں تک کہ اسلامی قلعے کی جو فصیلیں تربیتِ اسلامی نے تعمیر کی تھیں وہ ایک ایک کرکے منہدم ہوتی چلی گئیں اور مسلمانوں کے گھروں میں تربیت اسلامی سے عاری ایسے نوجوان مرد و زن بکثرت پیدا ہونے لگے جو ان بیرونی تہذیبی طاقتوں سے متاثر تھے۔ دشمن باہر سے حملہ آور تھا اور یہ اندر سے نقب لگا رہے تھے اور باقی معاشرے پر سحر زدگی کا عالم تھا کہ وہ خود اس اسلامی تربیت سے تہی دامن ہو چکا تھا جس نے اسے شعور و وجود بخشا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان ملک نہ صرف سیاسی طور

پر ان حملہ آوروں کے غلام بن گئے بلکہ وہ ان کی تہذیبی یلغار کے آگے بہہ نکلے۔

آج عالمِ اسلام جن حالات سے دوچار ہے وہ صحیح اسلامی تربیت کے فقدان ہی کا نتیجہ ہیں۔ اسلامی معاشروں میں ساری کمزوریاں اسی راہ سے آئی ہیں۔ امام دار الہجرۃ امیر المومنین فی الحدیث مالک بن انسؒ کا قول ہے کہ اس امت کے پہلے حصے کی اصلاح جس چیز کی بدولت ہوئی تھی اسی کے ذریعے آخری حصے کی اصلاح بھی ہوگی۔ ہم اپنے اسلامی ملی تشخص کی بازیافت کی جو جدوجہد کر رہے ہیں اس میں ہم اسی وقت کامیاب ہوں گے جب ہم اپنے معاشرے اپنے افراد کی تربیت انہی اسلامی خطوط پر کریں گے جن پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اوّلین اسلامی معاشرے کے افراد کی تربیت کی تھی۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

رُوداد ِ ابتلاء : احمد رائف مصری

ترجمہ جناب خلیل الحامدی

(۶)

مجھ سے کھڑا نہ ہوا گیا - میری پنڈلیاں سُن ہو چکی تھیں اور پاؤں زمین پر نہ جم سکتے تھے - زدوکوب کا حملہ اور سخت ہو گیا - ٹھوکروں اور گھونسوں نے مزید شدت اختیار کر لی تاکہ میں ان کے احکام کی تعمیل کروں اور "اصلاحِ احوال" کے لیے قدم بھروں جس کا برابر مطالبہ کیا جا رہا ہے - چنانچہ بڑی جد وجہد کے بعد میں پاؤں کے بل کھڑا ہو گیا - میجر نے گلا پھاڑ کر حکم دیا کہ میں تیز تیز چلوں - اور جب میں چل پڑا تو میرے قدموں نے محسوس کیا کہ وہ کسی ایسے تختے میں کُھبتے جا رہے ہیں جس پر بڑی تعداد میں بڑے نوکدار کیل لگے ہوئے ہوں - میں مارے درد کے چلّا اٹھا اور آخر کار بے تاب ہو کر زمین پر گر گیا - پہلے روز مجھے جو المناک سزا دی گئی یہ اس کا آخری باب تھا -

ابوزعبل کی جیل میں تعذیب یا تفتیش یا دونوں چیزیں ہمہ گیر شروع ہو گئیں - یہ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں - یہ تفتیش صبح گیارہ بجے شروع ہوتی تھی اور آدھی رات تک جاری رہتی - پھر میجر صاحبان لیفٹیننٹ کرنل صاحبان، کرنل صاحبان، یعنی اربابِ تفتیش و تحقیق گھروں کو چلے جاتے اور نظر بندوں کو کچھ اور لوگوں کے سپرد کر جاتے جو انہیں کل کی تفتیش کے لیے تیار کریں - اگلے روز دس بجے صبح یہ سب حضرات پھر ڈیوٹی پر آ جاتے -

دو روز کے بعد یہی طریق کار مستقل حیثیت اختیار کر گیا - میں جب بیرک واپس آیا تو وہ کئی اور افراد سے بھر رہی تھی - نئے نظر بند لائے جا چکے تھے - جو بیرک تیس افراد سے زیادہ کی وسعت نہ رکھتی تھی اس میں دگنے افراد بھر دیے گئے - میں اپنے بوریے پر اوندھے منہ آ گرا - میرے بوریے کا رقبہ تفتیش کے لیے جانے سے قبل جو کچھ تھا اُس میں بہت کمی آ چکی تھی - مختلف شہروں سے لوگ لائے جا چکے تھے - ان میں سے ہر ایک پر جو کچھ گزر چکی تھی اور جو اب گذر رہی تھی اُس سے بے حد خوف زدہ ، بدحواس اور وارفتہ ہو

چکا تھا۔

اگلے روز مجھے پھر اسی طریقہ سے اسی غیر مانوس جگہ لے جایا گیا۔ اس مرتبہ انہوں نے اپنی عادت کے مطابق تازیانوں اور زد و کوب سے تفتیش کا آغاز نہیں کیا۔ میری دونوں آنکھیں بند تھیں۔ میرے کان بے شمار آوازوں اور حرکتوں کو اخذ کر رہے تھے۔ یہ صاف سمجھ میں آرہا تھا کہ اس جگہ کے اندر جو جیل سے باہر ہے غیر معمولی نوعیت کی کوئی چیز موجود ہے۔ دریں اثنا کہ مجھے کسی طرف لے جایا جا رہا تھا ایک شخص نے میری گدی پر مکہ مارا۔ مجھے سخت ہراس اور قلق لاحق ہوا۔ مکّے سے نہیں، بلکہ اس بات سے کہ میں نے سُنا کہ ایک افسر نے مکّہ مارنے والے کو اس حرکت سے روک دیا ہے۔ مجھے تعجب ہوا اور اس وقت میں یہ اندازہ نہ کر سکا کہ افسر مذکور نے اسے کیوں منع کیا ہے۔ ایامِ نظر بندی میں میں نے پہلی بار زد و کوب سے منع کرنے کی آواز سُنی۔

میجر ف۔ ع آیا۔ میں نے اسے آواز سے ہی پہچان لیا۔ مجھے کہنے لگا،

مسٹر رائف مجھے افسوس ہے، میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہارے ساتھ یہ صورتِ حال پیش آئے۔ مگر کیا کریں مسلح افواج کے ہیڈ کوارٹر کی طرف سے یہی ہدایات موصول ہوئی ہیں۔

میں نے کہا، آپ کی مراد کیا ہے؟

دھمکی آمیز لہجہ میں وہ کہنے لگا: ہمارے پاس ایک فہرست آئی ہے جس میں کچھ نام ایسے ہیں......

میں کچھ دیر کے لیے چپ رہا اور پھر کہا: "میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا"؟

وہ بولا: "بعض نام (فہرست میں) ایسے ہیں جن کو سزائے موت دینے کا حکم ملا ہے۔ اس فہرست پر جناب فیلڈ مارشل عبدالحکیم عامر کے دستخط موجود ہیں۔

آپ کا مطلب؟

جن لوگوں کو سزائے موت دی جانے والی ہے اُن میں تمہارا نام سرِفہرست ہے۔

کیا یونہی مقدمہ چلائے بغیر...... ؟

مقدمہ سے آپ کی کیا مراد ہے؟ یقین جانیے یہ سب باتیں بالکل فضول ہیں۔

میں نے عرض کیا: تختۂ دار پر کب لٹک جانا ہوگا۔

جواب ملا، ابھی......

مجھے دُور سے دوڑ کر آنے والے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کوئی شخص قریب ہوا۔ اور ہانپتے ہانپتے پوچھنے لگا: وہ کہاں ہیں جن کے بارے میں سزائے موت کا فیصلہ ہوا ہے؟ میجر ف۔ع نے میرا بازو پکڑ کر کہا کہ یہ صاحب اُن پچاس افراد میں سے پہلے نمبر پر ہیں جو آج تختۂ دار پر لٹکائے جائیں گے۔ میجر نے مجھے اس غیر مانوس شخص کے حوالے کر دیا۔ اور وہ مجھے چند قدم کے فاصلے پر آگے لے گیا ——— میں طرح طرح کے خیالات میں ڈوب گیا: "کیا میری زندگی کا آج خاتمہ ہو جائے گا؟ ——— یونہی آسانی کے ساتھ؟ ——— مجھے یقین نہیں کہ فیلڈ مارشل عبدالحکیم عامر مجھے جانتا ہو ——— یہ لوگ مجھ سے اس قدر شدید نفرت کیوں کرتے ہیں ——— میں نے اُن کا آخر کیا بگاڑا ہے؟"

ماضی کی یادیں ذہن میں گردش کرنے لگیں۔ میری آرزوئیں اور امنگیں، میرے سہانے خواب اور حسین تمنائیں، میرا شوق مطالعہ اور وہ بے پناہ کیف جو مجھے کسی نئی کتاب کے مطالعہ سے حاصل ہوتا ——— یہ سب باتیں تسلسل کے ساتھ نظروں میں گھومنے لگیں۔ سوچا: کیا چند لمحات کے بعد یہ سب کچھ ساتھ لیے دُنیا سے رخصت ہو جاؤں گا ——— قانون کدھر گیا؟ ——— کہاں ہیں تہذیب کے دعوے؟ کدھر گئی ترقی پسندی کی رٹ؟۔ عدل و انصاف کے بارے میں اُمید کی آخری کرن بھی دماغ سے محو ہو گئی ——— مجھ پر غشی طاری ہو گئی۔ قے نے زور کیا ——— مگر اسی حالت میں میں اُس انسان کے پیچھے پیچھے چلتا رہا جو مجھے دار پر کھینچنے کے لیے لے جا رہا تھا۔

چلتے چلتے وہ شخص یکدم ٹھہر گیا۔ میں بھی ٹھہر گیا۔ میرے حواس مجھے جواب دے رہے تھے۔ کچھ اور قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میجر ف۔ع کی آواز آئی: "مرنے سے پہلے آپ کس آرزو کی تکمیل چاہتے ہیں"؟ عرض کیا: "دو رکعت نماز پڑھنا چاہتا ہوں، اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی تیاری کے لیے ——— زندگی کا فوری خاتمہ ہو رہا ہے۔ میں ملاقات کی تیاری کر کے نہیں چلا تھا۔"

نماز؟ کیا نماز؟ میجر بولا۔

اللہ تعالیٰ کے سامنے کچھ سرافگندگی کی اجازت؟

نہیں، نہیں۔ ہم نماز کی اجازت نہیں دے سکتے۔ یہ بات ہمارے اختیارات کے دائرے میں نہیں ہے۔

اس کے بعد پھانسی لگنے والا اور پھانسی دینے والے دونوں انسان کچھ اور آگے بڑھے۔ کچھ مزید

پیش قدمی کے بعد ایک شخص، جسے میں نہیں جانتا، مجھ پہ پل پڑا۔ میری آنکھوں پہ پٹی تھی اس لیے میں اُسے دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ مجھے دھڑام سے زمین پہ دے مارا، اور یکایک میرے ہاتھ پشت کے بل لوہے کی زنجیر میں باندھ دیے گئے۔ خلاف توقع اب میرے دل سے خوف و ہراس اور رنج و غم کے احساسات یکدم کافور ہو گئے ——— محسوس ہوا کہ اب آخری گھڑی آگئی۔ چند لمحات کے اندر ذبح کر دیا جاؤں گا۔ (دار پہ کھینچنے کے بجائے تیز دھار آلات سے بھی انسان ذبح کیے جاتے رہے ہیں) ——— دنیا کے اندر میرے خاتمہ کا یہ عظیم الشان ڈھب ہو گا ——— اب قتل ہوا چاہتا ہوں، اب قتل ہوا چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت و رضا کے دامن میں جھومتا جھومتا اُس کے حضور پہنچا چاہتا ہوں .... الی الرفیق الاعلیٰ .....‘‘

مگر اس آدمی نے مجھے اُٹھا کر کھڑا کر دیا۔ پھر یہ لوگ مجھے سیڑھیوں کے ذریعے اُوپر کہیں لے چلے۔ پٹی کے نیچے سے جو تھوڑی سی روشنی جھلک رہی تھی اُس کی مدد سے میں نے جگہ کو سمجھنے کی کوشش کی۔ مجھے ایک جگہ کھڑا کر دیا گیا۔ یہ ایک پتھروں کی بنی ہوئی گلی تھی جو سیڑھیاں ختم ہونے پر شروع ہو گئی۔ اس کے بعد مجھے آگے بڑھنے کا حکم ملا۔ آہستہ آہستہ۔ یہ انداز دل میں خوف اور دہشت پیدا کرنے والا تھا ——— اس گلی کے اندر میں کافی چلتا رہا، اور پھر مجھے حکم ملا کہ رک جا۔ پٹی کے ایک تنگ سوراخ میں سے میری نظر میرے قدموں پہ پڑی۔ میں نے دیکھا کہ ایک عمیق غار کے بالکل کنارے پہ کھڑا ہوں۔ اور اب ایک معمولی سا دھکا بھی اس غار میں گرانے کے لیے کافی ہے جس کی میرے خیال کے مطابق کوئی تہ نہیں ہے۔ میرے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال دیا گیا۔

ایک فوجی افسر عصام الشوکی[۱] میری طرف بڑھا۔ اور مجھے کہنے لگا کہ میں اپنی آخری جو دُعا تلاوت کرنا چاہتا ہوں کر لوں۔ کیونکہ اگلے جہاں منتقل ہو جانے کی گھڑی آپہنچی ہے۔ میں بڑی دلسوزی اور لجاجت کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگنے لگا کہ میرے گناہ معاف کر دیے جائیں۔ اب بے شک یہ بندۂ ناچیز تیری عظیم بارگاہ میں حاضر ہوا چاہتا ہے۔ زندگی میں مجھ سے جتنے گناہ صادر ہوئے تھے وہ اس وقت مجھے یاد آگئے۔ اس حالت میں ان گناہوں کو یاد کر کے میں سخت مغموم ہوا۔ اور یہ آرزو کرنے لگا کہ اگر مجھے کچھ اور مہلت مل جاتی تو گناہوں

[۱] طرہ کی جیل میں ہمیں یہ خبر ملی تھی کہ عصام الشوکی ۱۹۶۸ء میں ہوائی جہاز کے حادثہ میں ہلاک ہو گیا۔

سے مکمل پرہیز کرتا ۔ اور جو کچھ کر چکا ہوں ان کی تلافی کرتا ۔ اے میرے خدا، میرے رحیم و کریم مالک بس تیری رضا درکار ہے ۔

ڈھیلا ڈھالا پھندا جو میرے گلے میں ڈال دیا گیا تھا اُسے زور سے جھٹکا دیا گیا ۔ میرے قدموں کے نیچے گہری اور تاریک غار تھی ۔ دُور کہیں تازیانے برسنے کی صدائیں کان میں پڑ رہی تھیں جن کے ساتھ دردانگیز اور جگر دوز چیخیں اُٹھ رہی تھیں اور میرے اردگرد کی فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں ۔ لیکن یہ سب باتیں میرے اندر کوئی خوف و ملال پیدا نہ کر رہی تھیں ۔ مجھے صرف یہ فکر دامن گیر تھی کہ میں ایسے ڈھب میں اللہ کے دربار میں حاضری دوں کہ اس کی طرف سے میری مغفرت کا حکم صادر ہو جائے ۔

جس ڈھب سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے

جان تو آنی جانی ہے جان کی کوئی بات نہیں !

مجھے اپنی والدہ ماجدہ یاد آئی، بہنیں یاد آئیں، دوست احباب یاد آئے، وہ سب یاد آئے جو مجھ سے تعلق رکھتے تھے ——— اور پھر فضائے آسمانی سے یکایک نرم نرم، سکون بخش اور کیف آور جھونکے آئے، جنہوں نے مجھے پوری طرح لپیٹ میں لے لیا اور عالم بیخودی میں میری زبان پر دعا و استغفار جاری ہو گیا ۔

طویل عرصہ تک اسی عجیب و غریب کیفیت میں میں اپنی جگہ بت بنا کھڑا رہا ۔ مختلف چہرے میری خیالی دُنیا سے اٹھکیلیاں کر رہے تھے ۔ ہر جگہ اور ہر رنگ کے چہرے ۔ مجھے معلوم ہوا کہ میرے پاؤں اب مجھے اُٹھائے رکھنے کی قدرت کھو بیٹھے ہیں ۔ گردن میں پڑا ہوا پھندا سخت کسا ہوا تھا ۔ اس سے میرا گلا گھٹا جا رہا تھا ۔ اُدھر برابر انسانی چیخوں اور تازیانوں کی ضربوں کی آوازیں بگولے بن بن کر مجھ سے ٹکرا رہی تھیں ۔ اور پاؤں کے نیچے عمیق اور اندھی غار منہ کھولے مجھے تک رہی تھی ۔ ایک افسر میرے نزدیک آیا اور پھنکارتے ہوئے مجھے حکم دیا کہ "غار میں چھلانگ مارو" ——— میں نے اُسے کہا : "تم مجھے اس میں دھکا دے سکتے ہو ۔ میں خود اس میں چھلانگ نہیں لگاؤں گا ۔" وہ چلایا : "میں کہہ رہا ہوں چھلانگ مارو ۔ فیلڈ مارشل کا حکم ہے ۔" مجھ پر غنودگی طاری ہو گئی ۔ اور میں مدہوشی کے عالم میں آگے لڑھکا ۔ اور یکایک بلندی سے پستی میں جا گرا ۔ میرے اور غار کی تہ کے مابین صرف تین گز کا فاصلہ تھا ۔ دراصل وہ ایک گڑھا تھا جسے قوتِ تخیل نے ایک عمیق، اندھے اور جان لیوا غار کی صورت میں میرے ذہن میں پیوست کر رکھا تھا ۔

خستگی کی حالت میں مجھے گڑھے سے نکال کر ایک کمرے میں لے گئے جہاں چیخوں کی آوازیں قریب سے

قریب تر ہوگئیں۔ میری آنکھوں سے پٹی کھول دی گئی۔ میں نے دیکھا کہ میرے سامنے میجر ف۔ ع اور لیفٹیننٹ عصام الشو کی بیٹھے ہیں۔ میجر ف۔ ع نے کہا: "تمہاری قسمت اچھی نکلی۔ انٹیلی جنس کی طرف سے ابھی ابھی احکام آئے ہیں کہ تمہاری سزائے موت کو سردست ملتوی کر دیا جائے۔ اور وہ تھوڑی دیر تک اس فیصلے کی تفصیل سے ہمیں مطلع کریں گے۔" کچھ عرصہ فضا پہ سکوت طاری رہا۔ پھر میجر مجھ سے کہنے لگا:

تمہارے پاس جو معلومات ہیں ان سے ہمیں مطلع کرنا پسند کرو گے؟

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

کیا تمہیں کسی چیز کی خواہش ہے؟

میں نے پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

اُس نے مجھے لکڑی کی کرسی پیش کی اور مجھے اس پہ بیٹھنے کے لیے کہا، اور سگرٹ میری طرف بڑھایا اور پھر اُسے خود ہی میرے لیے سُلگایا۔ میں انگشت بدنداں تھا۔ مگر جلد ہی میری حیرت زائل ہوگئی، اُس نے قلم اور کاغذ میری طرف بڑھایا اور کہا: "اب تم اقرار نامہ تحریر کرو گے" ——— میں سراسیمہ ہوگیا۔ کس بات کا اقرار؟ بولا: "میں لکھواتا جاتا ہوں اور تم لکھو ——— تمہاری سابقہ گفتگو کی روشنی میں ہی بیان لکھواؤں گا۔" میں نے دل میں اُس کی اس پیشکش کا شکریہ ادا کیا۔ یہی کیا کم ہے کہ اُس نے تعذیب و توہین سے میری جاں بخشی کر دی ہے۔ میری تو گرفتاری کے ابتدائی لمحے سے یہی آرزو تھی کہ وہ ایسا طریقہ میرے ساتھ اختیار کرے۔ میجر نے بات کاٹتے ہوئے کہا: "یہ خیال مت کرنا کہ میں کوئی جھوٹ الزامات لکھواؤں گا جن کا ارتکاب تم نے نہ کیا ہو۔" میں نے فی الفور کہا "معاف فرمایئے، پاشا صاحب دروغ بافی کوئی معقول طریقہ ہے؟" وہ کہنے لگا: "مسئلہ صرف اتنا ہے کہ میں تمہارے متفرق بیانات کو مرتب کر کے واضح صورت میں لانا چاہتا ہوں"۔ میں نے کہا: "مجھے یہ بات ہر لحاظ سے منظور ہے"۔

وہ لکھواتا گیا اور میں لکھتا گیا۔ چنانچہ بڑے سائز کے ۹ صفحات میں نے بھر دیے ——— اس پوری کہانی کا خلاصہ یہ تھا کہ "میں نے چند دوستوں کے ساتھ مل کر حکومت کا تختہ اُلٹنے کے لیے منصوبہ تیار کیا تھا" اس اقرار کے بعد مجھے یقین تھا کہ یہ لوگ مجھے بیس سال سے کم سزا نہ دیں گے، اس لیے کہ انٹیلی جنس کے بیان کے موجب منصوبہ بالکل تیار تھا اور میری گرفتاری کی وجہ سے اُسے عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا۔

رات بھیگ چکی تھی۔ میں سپاہی کی حراست میں خوشی خوشی جیل لوٹ آیا۔ خیال ہوا کہ تفتیش مکمل ہوگئی ہے۔ اب

میرے سامنے اس کے سوا کچھ نہیں رہا کہ میں مقدمہ کی سرسری کارروائی کا انتظار کروں، اور پھر سیاسی قیدیوں کی جیل طرّہ میں داخل ہو جاؤں اور وہاں چلچلاتی دھوپ کے اندر اس وقت تک خاراشگنی کی مشقت برداشت کرتا رہوں جب تک اللہ کی مرضی ہے ——— اس طرح کے خیالات مجھے خوب لبھاتے تھے کیونکہ اُن کی رُو سے مجھے اس منحوس جگہ سے آخر کار چلا ہی جانا تھا۔

بیرک میں قدم رکھا تو دیکھا کہ صبح انسانوں کی جو تعداد چھوڑ کر گیا ہوں۔ اب اُس میں بھی دو چند اضافہ ہو چکا ہے۔ جیل کا قفس نما صحن جو دیکھا تو وہ بیسیوں افراد سے بھر رہا تھا جن کے تن پہ چیتھڑا تک نظر نہ آیا۔ اُن میں سے ایسے بدحال بھی تھے جو کہنیوں اور گھٹنوں کے بل چل رہے تھے، اور ایک عصا بردار انہیں ہانکے جا رہا تھا۔ کچھ افراد ایسے تھے جن کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور بالکل مادر زاد ننگے تھے اور دوڑ رہے تھے۔ اور دوڑتے دوڑتے سامنے کی دیوار سے جا ٹکراتے، اور بری طرح اپنا سر خود ہی پھوڑ بیٹھتے۔ اگر کوئی گر جاتا تو اُٹھ کر پھر دوڑنے لگتا۔ دوسرا منظر یہ تھا کہ کچھ لوگ لوہے کی سلاخوں والی دیوار کے ساتھ ننگ دھڑنگ لٹکے ہوئے ہیں۔ گویا وہ صلیب پہ چڑھے ہوئے ہیں۔ اور ان کی آنکھیں بند ہیں ——— خدایا! کیا یہ انسان ہیں؟ ——— انسانیت کہاں گئی؟ ——— میں بیرک کے ایک کونے میں جہاں جگہ ملی جا گرا اور گہری نیند سو گیا۔

تفتیشی کارروائیوں کے نتیجے میں بدن چور چور تھا، اسی غنودگی کی حالت میں صبح آنکھ کھلی۔ بیرک کے ساتھی میرے گرد جمع ہو گئے اور مجھ سے حالات دریافت کرنے لگے: کیا کچھ گزری؟ کیا کیا پوچھا گیا؟ آپ نے اس کا کیا جواب دیا؟ بعض سادہ دل حضرات نے یہ سوال بھی کیا کہ ہم سب کس روز گھروں کو جا رہے ہیں؟ ——— بیرک نظربندوں سے لبالب بھر رہی تھی۔ ان کی کثرت کی وجہ سے صورتِ حال بہت ناگفتہ بہ ہو گئی۔ ہمارے کھانے کی طرف اب منتظمین کو زیادہ توجہ نہ رہی۔ کئی کئی گھنٹوں کی تاخیر سے کھانا آتا۔ اور کھانے میں گوشت اس نوعیت کا ہوتا تھا کہ ناک اُس کی سڑاند برداشت نہیں کر سکتی تھی اور مضبوط سے مضبوط دانت اُسے چبانے کی سکت نہ رکھتے تھے۔ ہم صابون سے اُسے دھو لیتے تاکہ کچھ نہ کچھ بدبو جاتی رہے اور پھر منہ میں رکھ کر اُسے چوستے رہتے۔

اُن سیاہ دنوں کی بات ہے کہ ستمبر کے مہینہ میں کئی نابالغ بچے بھی جیل میں آ گئے۔ یہ تبلیغی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ جیل کے حالات دیکھ کر مارے خوف کے ہر لمحہ اُن کی بتیسی بجتی رہتی تھی۔ رسو چیے چھوٹے چھوٹے بچے

اد۔ ان پر آلام وشدائد کے یہ پہاڑ۔ نظربندوں میں جو سن رسیدہ بوڑھے تھے وہ بھی اس قدر ناتواں کہ نقل و حرکت سے بھی عاجز۔ وہ ہر وقت قرآن کریم کی تلاوت اور اللہ تعالیٰ سے دُعا و مناجات میں لگے رہتے کہ اللہ انہیں اس بڑھاپے میں استبداد و تعذیب کے دیو سے محفوظ رکھے۔ بیرک کے جس شخص کو بھی "تفتیش" کے لیے طلب کیا جاتا یہ بزرگ بوڑھے فوراً اُس کے حق میں سورۂ اخلاص کی تلاوت کرنے لگتے۔ ان کی پتھرائی ہوئی آنکھوں اور خوف زدہ چہروں سے برابر حزن و ملال اور غم واندوہ کا دھواں اُٹھتا رہتا تھا۔ ان بزرگوں کی اکثریت تفتیش کے لیے ایک مرتبہ بھی پیش نہیں ہوئی۔ مختلف جمعیتوں سے ان کا تعلق تھا۔ اور یہ سب نہ سیاسی شعور رکھتے تھے اور نہ سیاست میں ان کا کوئی عمل دخل تھا۔ وہ اس پر محو حیرت تھے کہ یہاں وہ کیوں لائے گئے ہیں۔ معاملہ صرف خوف و دہشت تک ہی محدود نہ تھا، بلکہ اس سے بھی زیادہ نازک اور سخت تھا۔ افکار کی گوناگونی اور نظریات کی بوقلمونی کے باوجود ان حضرات کو خوف، بھوک اور کرب نے شیر وشکر کر رکھا تھا —— اور وہ ایک دیرپا اور مقدس رشتے میں منسلک ہو کر یک جان بن چکے تھے۔

(باقی)

رسائل و مسائل

معراج رات کو ہوئی تھی یا دن کو؟

سوال:۔ پچھلے دنوں جیل جانے کا اتفاق ہوا۔ مختلف الخیال لوگوں میں مقصد کی یکسانیت اور رنگین تھی۔ درسِ قرآن اور نماز با جماعت کا انتظام تھا۔ لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ ہمارے علماء حضرات وہاں بھی فروعی مذہبی اختلافات میں مبتلا تھے۔ ہماری بیرک میں تین الگ الگ جماعتیں دیوبندی، بریلوی اور اہل حدیث حضرات کراتے تھے۔ میں نے دوستوں سے مشورہ کیا کہ علماء حضرات کو مل کر ایک جماعت پر رضامند کیا جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے ایک دیوبندی عالم کے پاس گئے۔ انہیں میرے متعلق علم تھا کہ یہ جماعت اسلامی کا رکن ہے۔ ابھی تمہیداً کچھ باتیں ہو رہی تھیں کہ انہوں نے آپ کے بارے میں اعتراض شروع کر دیے کہ مولانا مودودی صاحب نئی نئی باتیں نکال لاتے ہیں، کسی پچھلے ترجمان میں مولانا نے لکھا ہے کہ واقعۂ معراج دن کی پوری روشنی میں رونما ہوا تھا، حالانکہ قرآن کے بیان کے مطابق یہ واقعہ رات کے کسی حصہ میں پیش آیا اور حدیث سے بھی ثابت ہے کہ معراج عشاء اور فجر کے درمیان ہوا تھا۔ میں نے اس بارے میں اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ چنانچہ الصلوٰۃ جامعۃ والا مقصد تو باتوں ہی میں ختم ہو گیا اور گفتگو آگے نہ بڑھ سکی۔

جیل سے واپسی پر میں نے ترجمان کے پچھلے پرچے دیکھے۔ جنوری ۱۹۷۲ء کے شمارے میں صفحہ ۱۰ پر آپ کی تحریر دیکھی؛

"...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مشاہدہ اندھیرے میں، یا مراقبے کی حالت میں، یا خواب میں، یا نیم بیداری کی حالت میں نہیں ہوا تھا، بلکہ صبحِ روشن طلوع ہو چکی تھی، آپ پوری طرح بیدار

تھے، کھلی فضا میں اور دن کی پوری روشنی میں اپنی آنکھوں سے یہ منظر ٹھیک اسی طرح دیکھ رہے تھے جس طرح کوئی شخص دنیا کے دوسرے مناظر دیکھتا ہے"۔

اس سے معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کا اعتراض اسی عبارت پر تھا۔ بہتر ہو کہ آپ اس کی وضاحت کر دیں۔

جواب:- معراج کے بارے میں یہ بات میں نے کبھی کہی، نہ لکھی، اور نہ میرے دماغ میں کبھی یہ خیال آیا کہ یہ واقعہ دن کے وقت پیش آیا تھا۔ تفہیم القرآن جلد دوم، تفسیر سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت کا ترجمہ اور اس پر میرا مفصل حاشیہ دیکھ لیں۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ میرے نزدیک معراج رات کو ہوئی تھی یا دن کو۔

سورۂ نجم کی آیات ۴ تا ۱۲ میں جبریل علیہ السلام سے حضورؐ کی پہلی ملاقات کا ذکر ہے، جس کا معراج سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی کے متعلق میں نے لکھا ہے کہ یہ مشاہدہ دن کی روشنی اور پوری بیداری کی حالت میں ہوا تھا۔ تفہیم القرآن جلد پنجم (صفحات ۱۸۸-۱۸۹ اور ۱۹۳ تا ۲۰۰) میں اس کی پوری تشریح موجود ہے۔

رہی وہ بحث جو جنوری ۱۹۷۶ء کے ترجمان القرآن میں صفحہ ۱۰ پر کی گئی ہے تو اس کا عنوان "جبریلؑ سے حضورؐ کی پہلی ملاقات زمین پر" خود ہی صاف ظاہر کر رہا ہے کہ یہ آسمان والی ملاقات کا ذکر نہیں ہے۔ اس پوری بحث کو آپ پڑھیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ معراج کے سلسلے میں یہ بحث صرف اس لیے کی گئی ہے کہ ایسے غیر معمولی مشاہدات پر حضورؐ کے مبتلائے شک نہ ہونے کی وجہ کیا تھی۔ اس سے آگے سدرۃ المنتہیٰ پر جبریلؑ سے حضورؐ کی دوسری ملاقات کا ذکر صفحہ ۱۲ پر ہے۔ اسے بھی پڑھ کر دیکھ لیں کہ سلسلۂ بیان کیا ظاہر کر رہا ہے۔

درحقیقت ان حضرات کی عادت یہ ہے کہ کسی شخص کی کسی عبارت کا ایک آدھ فقرہ لے کر اس پر الزامات کی ایک پوری عمارت کھڑی کر دیتے ہیں، اور اس تحقیق کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتے کہ اس شخص نے اپنی دوسری تحریروں میں اس مسئلے کے متعلق کیا لکھا ہے۔ یہ تحقیق اگر وہ کریں تو ان کو خود معلوم ہو جائے کہ ان کے الزامات خالص افترا اور بہتان ہیں۔ بالفرض اگر وہ یہ عذر کریں کہ ہمارے پاس اتنی تحقیق کی فرصت نہیں ہے تو ان سے پوچھیے کہ دوسرے لوگوں پر الزامات چسپاں کرنا اور انہیں پھیلانا آپ پر کس نے واجب کیا ہے کہ یہ کام لامحالہ آپ کو کرنا ہی چاہیے۔

طعام المسکین کے معنی

سوال: سورۂ الحاقہ اور سورۂ ماعون کی آیت وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ کا ترجمہ دونوں جگہ تفہیم القرآن میں مختلف ہے۔ ایک جگہ ترجمہ مسکین کو کھانا کھلانا کیا گیا ہے، اور دوسری جگہ مسکین کا کھانا دینا۔ اس فرق کی کیا وجہ ہے؟

جواب: طعام کا لفظ عربی زبان میں "کھانے" کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، یعنی وہ چیز جو کھائی جائے۔ اور اِطعام کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے، یعنی کھانا کھلانا۔

پہلے معنی کے لحاظ سے طعام المسکین کا مطلب ہے "مسکین کا کھانا" اور اس سے خود بخود یہ معنی نکلتے ہیں کہ جو کھانا مسکین کو دیا جاتا ہے وہ اسی کا کھانا ہے، ذی استطاعت آدمی کے کھانے میں اس کا کھانا بطور ایک حق کے شامل ہے جسے اس کو ادا کرنا چاہیے۔ یہی بات قرآن مجید میں ایک دوسرے طریقے سے یوں بیان کی گئی ہے کہ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ اور "اُن کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک حق ہے"۔

دوسرے معنی کے لحاظ سے مطلب واضح ہے۔ ولا یحض علی طعام المسکین کے معنی یہ ہیں کہ وہ مسکین کو کھانا کھلانے کے لیے کسی کو آمادہ نہیں کرتا۔

اسلامی نظامِ تعلیم

سوال: ۱۔ اسلامی نظامِ تعلیم سے کیا مراد ہے؟

۲۔ آپ کی نگاہ میں پاکستان کی بقاء و استحکام کے لیے اسلامی نظامِ تعلیم کی ضرورت و اہمیت کیا ہے؟

۳۔ اسلامی نظامِ تعلیم کی طرف بڑھنے کی کوششوں کے راستے میں کونسی طاقتیں مزاحمت کر رہی ہیں؟

۴۔ آپ کے خیال میں گذشتہ ۲۰ برس میں پاکستان اسلامی نظامِ تعلیم کے قریب آیا یا دور ہٹا ــــ؟

۵۔ آپ کے نزدیک اسلامی نظامِ تعلیم کو عملاً بروئے کار لانے کے لیے کونسے اقدامات ضروری ہیں؟

تعلیمی، تہذیبی، ملّی - اور جغرافیائی زندگی پر اس نظریے کے کیا اثرات مرتب ہونے چاہییں؟

۶۔ "نور خاں تعلیمی پالیسی" کے نفاذ کی راہ میں کون سا مخفی رکاوٹ بنا؟

جواب:- ۱- اسلامی نظامِ تعلیم سے مراد ایسا نظامِ تعلیم ہے جس میں تعلیمی نصاب کے جملہ اجزاء کو اسلامی اصول و نظریات کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہو۔ معلمین و متعلمین دونوں کی دینی و اخلاقی تربیت کا خاص خیال رکھا گیا ہو اور عربی زبان اور کتاب و سنت کی ضروری و اساسی تعلیمات کو نظامِ تعلیم کا جزو لازم قرار دیا گیا ہو۔

۲- پاکستان کے بقاء و استحکام کے لیے اسلامی نظامِ تعلیم کی ضرورت و اہمیت کا اندازہ اس حقیقت کو ذہن نشین کر لینے سے ہو سکتا ہے کہ ملک و قوم کی قیادت ہمیشہ تعلیم یافتہ طبقے ہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور ان پڑھ یا نیم خواندہ طبقے اپنے قائدین ہی کے پیچھے چلتے ہیں۔ تعلیم یافتہ طبقے کے بناؤ اور بگاڑ میں نظامِ تعلیم کو جو مقام حاصل ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔

۳- اسلامی نظامِ تعلیم کی طرف پیش قدمی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ وہ حکومت ہی ہے جو ایسے نظام سے واقف بھی نہیں ہے اور خائف و گریزاں بھی ہے۔

۴- گذشتہ ۲۰ برس میں پاکستان اسلامی نظام تعلیم کی طرف ایک قدم آگے بڑھا ہے تو دو قدم پیچھے ہٹا ہے۔

۵- اسلامی نظامِ تعلیم کو بروئے کار لانے کے لیے دو طرح کے اقدامات ضروری ہیں - ایک وہ جو تعلیم گاہوں کے اندر سے شروع ہوں، دوسرے وہ جن کا آغاز باہر کی رائے عام کے دباؤ سے ہو- دونوں محاذوں پر پُر امن، منظم اور مسلسل جد وجہد کی ضرورت ہے - اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ زندگی ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے - اس لیے سیاسی، معاشی، معاشرتی میدان میں جب تک اسلامی انقلاب رونما نہ ہوگا تعلیمی میدان میں تبدیلی آسان اور دیرپا نہ ہوگی۔

۶- معلوم نہیں کہ نور خاں تعلیمی پالیسی کے نفاذ میں کونسا مخفی رکاوٹ بنا؟

نبی کی آمدِ ثانی سے مراد کیا چیز ہوتی ہے؟

سوال:- قادیانیوں کا خیال ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السّلام کی دوبارہ آمد کا نظریہ مسلمانوں کی غلط فہمی ہے۔

ان کی جگہ مرزا صاحب مثیلِ عیسیٰ آچکے۔ مگر لوگوں نے انہیں نہیں پہچانا بلکہ جو چاہا ان کے سامنے سلوک کیا، حالانکہ دراصل آنے والے مرزا صاحب ہی تھے نہ کہ دو ہزار سال پہلے گزرے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔

اِس خیال کی تائید میں تفہیم القرآن جلد ۴، صفحہ ۳۰۵ - ۳۰۶ کی عبارت پیش کی جاتی ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے:

"حضرت یحییٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی بعثت کے زمانہ میں بالعموم یہودی تین آنے والوں کے منتظر تھے۔ ایک حضرت الیاس دوسرے مسیح تیسرے "وہ نبی" .... حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ فرما کر ان کی غلط فہمی کو رفع فرمایا کہ ایلیاہ تو آچکا .... اس سے حواری خود جان گئے کہ دراصل آنے والے حضرت یحییٰ تھے نہ کہ آٹھ سو برس پہلے گزرے ہوئے حضرت الیاس"۔

براہ کرم مطلع فرمائیں کہ کیا نبی کی آمدِ ثانی سے مراد اس کے مثیل کی آمد ہوا کرتی ہے؟

جواب:- (از ملک غلام علی صاحب) تفہیم القرآن کی جس عبارت کا حوالہ آپ نے دیا ہے۔ اس سے قادیانی نبوت کی تصدیق یا مسلمانوں کے کسی اعتقاد کی تردید نہیں ہوتی۔ حضرت یحییٰ کا جو قول بائبل میں منقول ہے، اگر اس کی نسبت صحیح ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت الیاس پہلے آچکے۔ اب الیاس یا ان کے کوئی مثیل نہیں آئیں گے بلکہ میں (یحییٰ) ایک دوسرا نبی مبعوث کیا گیا ہوں۔ اگر یحییٰ علیہ السلام یہ کہتے کہ میں مثیل الیاس ہوں اور میرے آنے کو الیاس ہی کی آمدِ ثانی سمجھو جبکہ وہ فوت ہو چکے ہیں، تب البتہ قادیانی اپنے حق میں کوئی بات بنا سکتے تھے۔

یہ قادیانیوں کی کھلی اور گمراہانہ تاویل بازی ہے کہ وہ ایسے تنکوں کا سہارا لے کر اپنی نبوت کی گنجائش پیدا کرتے ہیں۔ مسلمان مسیح ابن مریم کی آمد کے قائل ہیں، کسی مثیل مسیح کی پیدائش کے قائل نہیں ہیں۔ حدیث میں بھی ابن مریم کے نزول کا ذکر ہے، کسی مثیل مسیح یا مسیح موعود کا ذکر نہیں۔ یہ مثیل، بُروز وغیرہ کا تصور خالص ہندوانہ اور مشرکانہ ہے۔ یہ وہی اوتار یا تبت کے دلائی لامہ والا عقیدہ ہے جس کے مطابق ایک روح مختلف قالب اور جامے بدل بدل کر دنیا میں بار بار آتی رہتی ہے۔ ہمارے نزدیک جب آئیں گے تو حضرت عیسیٰ ابن مریم ہی آئیں گے جنہیں نبوت عطا ہو چکی تھی اور اس پر ہم پہلے ہی ایمان رکھتے ہیں۔

ذبیحہ کے لیے تسمیہ شرط ہے یا نہیں؟

سوال:- ایک خاص مسئلے کی وجہ سے آپ کا قیمتی وقت لینا چاہتا ہوں۔ یہاں کینیڈا میں مشرق اوسط سے آئے ہوئے عرب بھائیوں نے یہ موقف اختیار کر رکھا ہے کہ اہلِ کتاب کا ذبیحہ جسے قرآن میں حلال قرار دیا گیا ہے اُس کے تحت وہ تمام گوشت آجاتا ہے جو یہاں کی دکانوں میں فروخت ہوتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جانور کو ذبح کرتے وقت اللہ اکبر یا بسم اللہ کہنا ضروری نہیں ہے کیونکہ تسمیہ ذبح کے لیے شرط نہیں۔ جو گوشت بھی مشینوں سے کٹ کر بازاروں میں آتا ہے اُسے کھاتے وقت بسم اللہ کہہ دینا کافی ہے۔

جواب:- (از ملک غلام علی صاحب) عرب دوستوں کی یہ بات عجیب و غریب ہے کہ ذبح کے لیے تسمیہ شرط نہیں ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ہی جانور ذبح کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اُسے مت کھاؤ (انعام: ۱۲۱)۔ اہلِ کتاب کا ذبیحہ اور طعام انہی شرائط کے تحت حلال ہے جو قرآن میں دوسرے مقامات پر مذکور ہیں۔ ورنہ اہلِ کتاب کے کھانے میں خنزیر بھی تو ہوتا ہے۔ اگر اہلِ کتاب کا کھانا (طَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ) مطلقاً حلال ہو تو خنزیر کو بھی حلال ہونا چاہیے تھا۔ ان کے طعام کی حلت کے متعلق حکم ایسا مطلق نہیں ہے جسے دوسرے قرآنی احکام مقید نہ کرتے ہوں۔ ہمارے ائمہ میں صرف امام شافعی کا ایک قول مروی ہے کہ مسلمان اگر اللہ کا نام نہ لے تب بھی اس کا ذبیحہ حلال ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مسلمان کا عقیدہ اور نیت بھی یہی ہوتی ہے کہ وہ اللہ کا نام لے کر ذبح کر رہا ہے، اس لیے اس کا زبان سے ذکر نہ کرنا حلت پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ امام شافعیؒ سے اس کے بالمقابل دوسرا قول بھی مروی ہے جس میں تسمیہ کو لازم قرار دیا گیا ہے۔ میرے علم میں کوئی دوسرا امام یا فقیہ نہیں جو بغیر تسمیہ کے ذبیحہ اہلِ کتاب کو حلال سمجھتا ہو۔

مطبوعات

فقہائے ہند جلد سوم	مصنّف: مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب۔ ناشر: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ - لاہور

کتابت و طباعت عمدہ

صفحات: ۴۰۰ قیمت: -/۲۲ روپے

زیر تبصرہ کتاب "فقہائے ہند" کی جلد سوم ہے۔ اس میں دسویں صدی ہجری کے ۲۵۲ فقہائے ہند کا تذکرہ ہے۔ کتاب کے آغاز میں ایک قابلِ قدر مقدمہ بھی درج ہے جس میں سکندر لودھی کے عہدِ حکومت سے لے کر مغلیہ شہنشاہ ہمایوں کے دورِ سلطنت تک کے مذہبی اور دینی رجحانات کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اسی طرح اس دور کے والیانِ ریاست کے حالاتِ زندگی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس دور کے حکمرانوں اور فرمانرواؤں کی اکثریت نیک دل، منصف مزاج اور پاکیزہ سیرت کے مالک افراد پر مشتمل تھی۔ یہ فرمانروا علم دوست تھے اور علمائے کرام کو عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کی علمی مجلسوں میں حاضر ہوتے اور امورِ سلطنت میں ان کی قیمتی آراء کو اہمیت دیتے۔

اس علمی اور دینی فضا کا نتیجہ تھا کہ صرف ایک صدی میں برصغیر ہند و پاک نے اڑھائی سو سے زائد نابغۂ روزگار فقہاء کو جنم دیا۔ فاضل مؤلف نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ اسّی سے زیادہ کتابوں کی ورق گردانی کر کے ان علماء و فقہاء کے حالاتِ زندگی تلاش کیے ہیں اور ان کو افادۂ عام کے لیے مجموعہ کی صورت میں لوگوں کے سامنے پیش کر دیا ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ سے ہمیں اپنے بزرگانِ دین اور ان کے علمی و فقہی کارناموں سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ اور اپنے ماضی پر بجا طور پر ناز ہوتا ہے جس نے اتنے بلند پایہ دانشور، ادیب، شاعر اور فقیہ پیدا کیے۔

کتاب کی کتابت و طباعت اچھی ہے

شرح اسماء الحسنیٰ | مصنف: قاضی محمد سلیمان منصور پوری۔

ناشر: مکتبہ نذیریہ۔ قینچی امرسدھو۔ فیروز پور روڈ۔ لاہور

صفحات : ۲۶۵ کاغذ و طباعت عمدہ

قیمت : بارہ روپے

مولانا قاضی محمد سلیمان منصور پوری رحمۃ اللہ علیہ کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ وہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں "رحمۃ للعالمین" کا ہدیۂ خلوص و عقیدت پیش کر کے شہرت دوام حاصل کر چکے ہیں۔ قاضی صاحب جہاں ایک مستند اور بلند پایہ مؤرخ ہیں وہاں دینی تعلیمات کے پابند بھی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب میں فاضل مؤلف نے اللہ تعالیٰ کے ننانوے (۹۹) اسمائے حسنیٰ کی دلپذیر لیکن عام فہم تشریح کی ہے۔ اور ہر اسم مقدس کا انسانی سیرت و کردار پر جو اثر مترتب ہوتا ہے اور جن برکات کا پیکر ہوتا ہے اُن کا بیان بھی نہایت ہی عمدہ پیرایہ میں کیا ہے۔ مسلمانوں کی عظیم اکثریت اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کا وِرد کرتی ہے لیکن اُن میں سے بہت ہی قلیل تعداد ان اسماء الحسنیٰ کے مفہوم و معانی اور ان کے تقاضوں کا شعور رکھتی ہے۔ شرح اسماء الحسنیٰ کا مطالعہ ان سعید روحوں کے لیے جو اللہ تعالیٰ کے مقدس ناموں کو وِردِ زبان رکھتی ہیں، بہت مفید ثابت ہو گا۔ ان اسمائے گرامی کی حقیقی عظمت کا نشان ان کے دل پر نقش ہو گا اور حقیقی روحانی لذت سے بہرہ ور کرے گا۔

کتابت و طباعت نہایت عمدہ ہے اور قیمت بھی مناسب ہے۔

کا دل تو کڑھتا ہو عملاً دین کی خلافِ اسلام حرکات دیکھ کر اور وہ اُن کی اصلاح کے فکر مند ہوں مگر مذاق اڑایا جائے شعائرِ دین کا؟ صحیح بات یہ ہے کہ ان "مصلحینِ قوم" کو معاشرے کی غیر اسلامی روش سے قطعاً کوئی کوفت نہیں ہوتی، بلکہ اُن کے دل یہ اندوہناک صورتِ حال دیکھ کر مسرور ہوتے ہیں۔ انہیں اگر تشویش لاحق ہوتی ہے تو صرف اس بات سے کہ عوام میں دینی اقدار کا کوئی احترام موجود ہے۔ اس بنا پر وہ اُنہیں ہدفِ استہزاء بنا کر اُن کا وقار گرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ شعائرِ دین کا استہزاء خوش طبعی یا ادبی ذوق کی علامت نہیں، بلکہ دل میں دین کے خلاف کینہ و بغض کے وجود کی شہادت ہے۔ مفسرین اور فقہا نے اس امر کی صراحت کر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ، اُس کی آیات اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا استہزاء کفر ہے۔ احکام القرآن کے معروف مصنف امام ابوبکر احمد بن علی نے، جو دینی حلقوں میں الجصاص کے نام سے متعارف ہیں، سورۂ توبہ کی مندرجہ ذیل آیات پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے:

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا	اگر آپ اُن سے سوال کریں تو کہہ دیں گے کہ ہم تو
نَخُوضُ وَنَلْعَبُ ط قُلْ أَبِاللَّهِ	محض مشغلہ اور خوش طبعی کر رہے تھے۔ آپ کہہ دیجیے
وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِئُونَ ٥	کہ اچھا تم استہزاء کر رہے تھے اللہ اور اس کی آیتوں
لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ	اور اس کے رسول کے ساتھ؟ اب بہانے نہ بناؤ۔ تم کافر
إِيمَانِكُمْ ط	ہو چکے ہو اپنے اظہارِ ایمان کے بعد۔

امام موصوفؒ اور دیگر فقہا کا فتویٰ یہ ہے کہ دین کا استہزاء خواہ لطیفہ گوئی اور خوش طبعی سے ہو یا ارادہ اور سنجیدگی سے کفر کے دائرہ میں آتا ہے، کیونکہ محولہ بالا آیات میں اللہ تعالیٰ نے اُن کے عذرِ دل لگی کو بالکل مسترد کر کے حکمِ کفر اُن پر باقی رکھا ہے۔ حالتِ جبر و اکراہ کا حکم البتہ اس سے الگ ہے۔ بالفرض ان "خوش باش" لوگوں کی یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے کہ اُن کا مقصود شعائر اللہ کی توہین نہیں بلکہ محض خوش طبعی ہے، جب بھی اُنہیں یہ سوچنا ضرور چاہیے کہ وہ دل لگی آخر کن چیزوں سے کر رہے ہیں؟ اللہ رب العزت، اُس کی قدرت اور اُس کے احکام سے؟ اُس کے رسولؐ سے جس کے بابرکت وجود سے ہمیں ایمان کی دولت نصیب ہے؟ یہ چیزیں آخر کسی صورت میں بھی محلِ استہزاء ہو سکتی ہیں؟

اَلْجِهَادُ فِی الْاِسْلَام

سید ابوالاعلیٰ مودودی کی اوّلین تصنیف

— جو کہ ۲۳ سال کی عمر میں تحریر کی گئی
— جس کی علامہ اقبالؒ نے بھی تعریف و تحسین فرمائی۔
— جسے تحریکِ قیامِ پاکستان کے دوران میں مسلمانوں میں جذبۂ جہاد پیدا کرنے کے لیے کثیر تعداد میں چھپوایا گیا۔
— اسلام کے نظریۂ جہاد اور قانونِ صلح و جنگ کی بہترین اور مکمل تصویر۔
— دیگر مذاہب و اقوامِ عالم کے جنگی مقاصد و نظریات

اور

بین الاقوامی قوانینِ قتال کا تقابلی مطالعہ
— اسلامی قواعدِ جہاد کی برتری کے تفصیلی دلائل۔
— جہاد کے مخالفین و معترضین کو مسکت جواب
درجنوں کتب و دستاویزات کے مطالعہ کا نچوڑ

چھ سو صفحات ——— قیمت ۲۳/۰۰ روپے

ملنے کا پتہ

ادارہ ترجمان القرآن۔ اچھرہ۔ لاہور